جماعتِ اسلامی

کے

زوال کے اسباب اور احیا کے تقاضے

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبا کراچی یونی ورسٹی (۵۶-۱۹۵۵)

وراثت پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب
اور
احیا کے تقاضے

جاوید اکبر انصاری
سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ جامعہ کراچی (۶۶-۱۹۶۵)

www.kitabosunnat.com

وراثت پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
فون نمبر: +92 321 4539047 +92 321 2849000

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

286.4
2.Z-12Z

نام کتاب جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب اور احیا کے تقاضے
تصنیف ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
طبع اول ۲۰۱۴ء
صفحات ۱۲۸
سائز ۲۳×۳۶/۱۶
ناشر سید رئیس بابر گردیزی
برائے وراثت پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
+92 3212849000 +92 3224539047
Fax: +92 4235418153

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹- جے ماڈل ٹاؤن - لاہور
نمبر......25469......

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

مذہبی سیاسی جماعتیں عوامی مقبولیت کیوں حاصل نہیں کر پا رہی ہیں؟ ۲۹

۲۰۱۳ء کے انتخابی نتائج اور تحفظِ دین اور غلبہ دین کی جدوجہد ۶۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

"...محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت کا فلسفہ

اس باب کا موضوع جمہوریت ہے۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ جمہوریت کی اصلیت، ماہیت اور اس کی حیثیت و حقیقت اور موجودہ زمانے میں اس کے کردار کے حوالے سے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کروں اور اس ضمن میں اس حکمتِ عملی کا بھی تذکرہ کروں جس کو اپنا کر عالمی اور ملکی سطح پر بھی ایک جمہوری معاشرہ اور جمہوری ریاست قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بنیادی طور پر جو نظام زندگی آج پوری دنیا میں غالب ہے اسے ہم سرمایہ داری کہہ سکتے ہیں۔ یہ فکر اور نظام انسان کو خدا کے بندے کے بجائے حرص و حسد کا بندہ بناتا ہے اسی کو ہم کہتے ہیں "خدا کے بندے کو سرمایہ کے بندے میں تبدیل کر دینا"۔ (Transforming the subject of God into subject of Capital.) جو نظام اس وقت غالب ہے وہ سرمایے کا نظام ہے اور سرمایے سے مراد حرص و حسد کے سوا کچھ نہیں۔ سرمایے کی حیثیت صرف یہ ہے کہ حرص و حسد قلوب کو مسخر کر لیں۔ یہ کیفیت صرف امیر آدمی پر طاری نہیں ہوتی۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ صرف تاجر اور صنعت کار کو حرص و حسد مسخر کریں یہ مزدور کو بھی مسخر کر سکتے ہیں۔ ایک یونی ورسٹی میں پڑھانے والے کو بھی حرص و حسد مسخر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حرص و حسد کی یہ کیفیت جس شخص اور جس معاشرے پر غالب ہو وہ شخصیت سرمایہ دارانہ شخصیت اور وہ معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرہ ہے خواہ نظریاتی طور پر وہ معاشرہ کیسے ہی دعوے کرے۔ لہٰذا سرمایہ داری دراصل کسی بھی معاشرے میں حرص و حسد کے جذبات خبیثہ کے عام ہو جانے کی کیفیت کا نام ہے۔ ان معنوں میں سرمایہ داری ایک عمومی تصور ہے۔ جس میں ہر وہ شخص شامل ہوتا ہے جس کے قلب پر حرص و حسد کا قبضہ ہو جائے۔ ان معنوں میں سرمایہ دارانہ نظام سے ہماری مراد وہ نظام ہے کہ جہاں کا تعقل اور جہاں کی ترتیب اعمال اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ حرص و حسد کو ایک منظم انداز میں فروغ حاصل ہو۔

جمہوریت سرمایہ داری کے غلبے کی تنظیم

اس سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کو ہم جمہوریت کہتے ہیں۔ جمہوریت سرمایہ داروں کے غلبے کا آلہ کار ہے۔ جمہوریت کا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں تو رکھ لیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن تاریخی طور پر جس چیز کو جمہوریت کہا گیا اور جو بہ حیثیت جمہوریت کے غالب آئی ہے یہی چیز ہے۔ معاشرے اور ریاست کی وہ صف بندی جس کے نتیجے میں سرمایے کا غلبہ ممکن ہوسکے، تاریخی طور پر ہم اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ مغربی تناظر میں اگر ہم جمہوریت کے فروغ اور ارتقا کی کوئی تاریخ لکھیں اور کوئی ہم سے پوچھے کہ جمہوریت کیا چیز ہے؟ تو ہم یہی عرض کریں گے کہ جمہوریت وہ معاشرتی اور ریاستی صف بندی ہے جس کے نتیجے میں سرمایے کی بالادستی اور سرمایے کا غلبہ انفرادی زندگی پر بھی اور معاشرے اور ریاست پر بھی مسلط ہو جاتا ہے اور مستحکم کیا جاتا ہے۔ جمہوریت کا مقصد سرمایے کے غلبے کو مستحکم کرنا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ جمہوریت کی تعریف اگر تاریخی طور پر کی جائے تو اس طریقے سے کی جاسکتی ہے کہ جمہوریت وہ نظام، وہ معاشرتی و سیاسی حکمتِ عملی ہے جس کے نتیجے میں سرمایے کے غلبے کو بہ حیثیت مجموعی انفرادی سطح پر، منظم و مربوط طریقے سے معاشرے کی سطح پر اور ریاست کی سطح پر قائم کیا جاتا ہے۔

جمہوریت میں فرد کی اخلاقی حیثیت سے کوئی بحث نہیں

جمہوریت جس بنیادی مفروضے پر قائم ہے، وہ یہ ہے کہ تمام افراد برابر ہیں۔ ہر فرد دوسرے فرد کے برابر ہے ان معنوں میں کہ اس نے جس طریقے سے بھی اپنے نفس میں خواہشات کا پیمانہ مرتب کیا ہے۔ وہ اس کی اس حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ وہ معاشرے میں کیا مقام رکھتا ہے یا ریاست میں کیا مقام رکھتا ہے۔ وہ شخص جو عابد و زاہد ہے جس کی زندگی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں اور خواہشات کے مطابق مرتب ہوتی ہے اور وہ شخص کہ جس نے اپنے نفس کو شیطان کے سپرد کر دیا ہے اور جس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنا زندگی کا مقصد ہے، ریاست اور معاشرے کی سطح میں دونوں برابر ہیں یک ساں اہمیت کے حامل ہیں۔ آزادی کے اسی تصور پر جمہوریت کی بنیاد ہے۔ ایک فرد کے اپنے نفس کے اندر جو بھی خواہشات، میلانات اور جذبات ہیں ان کی ترتیب کس نوعیت کی ہو اس سے معاشرتی عدل اور ریاستی عمل کے تعین کا کوئی تعلق نہیں۔ معاشرتی عدل و تنظیم اور ریاستی تنظیم میں اس کو دوسرے فرد کے برابر سمجھا جائے گا اس چیز سے آنکھیں بند کر کے کہ اس کی اپنی اخلاقی زندگی (Moral Life) اور اس کی اپنی تعینِ اقدار کیا ہے؟ ان معنوں میں آپ ہر دوسرے شخص کے برابر ہیں۔ ایک زانی اور شرابی ایک نمازی اور پرہیز گار کے برابر ہے۔ اسی طریقے سے ان کا ایک ووٹ ہے اسی طریقے سے وہ سرمایہ دارانہ معاہدے (Contract) کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شریک حصہ دار ہوسکتا ہے جس طریقے سے دوسرا شخص۔ تو جمہوریت کی بنیاد یہ ہے ہم اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ لوگوں کی اخلاقی اور روحانی حالت اور کیفیت کیا ہے؟ ان کی روحانی اور اخلاقی کیفیت اور حالت کچھ بھی ہو معاشرے اور ریاستی نظام میں ان کا مقام یک ساں ہے اسے ہم کہتے ہیں Equal Freedom (مساوی آزادی)۔ ان معنوں میں مساوات اور آزادی بالکل لازم وملزوم ہیں۔

اسلامی معاشرتی درجہ بندی کیا ہے؟

ناممکن ہے کہ ہم ایک ایسا نظام تعمیر کریں جو عبادتِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہو اور اس کے اندر ہم مساوات کو شامل کرلیں۔ لازماً اگر ہم نے ایک ایسا نظام قائم کیا کہ جس کے اندر عبادت مقصود ہے اور عبادت کو متشکل کرنے کے لیے ہم اپنے معاشرے اور ریاست کی صف بندی کررہے ہیں تو لازماً ہمیں اسلامی درجہ بندی کو قبول کرنا ہوگا۔ اسلامی معاشرتی درجہ بندی کو قبول کرنا ہوگا۔ میں چوں کہ ایک جاہل آدمی ہوں اس لیے اس کی تفصیل نہیں بیان کرسکتا لیکن اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جہاں اہلِ تقوا، اہلِ رائے اور اللہ والے قیادت کا منصب اختیار کریں گے اور باقی ان کے تابع ہوں گے وہ مزکی اور مربی ہوں گے اور باقی حضرات کی تربیت فرمائیں گے۔ اسلامی صف بندی اسی درجہ بندی کی بنیاد پر ہوتی ہے جہاں ہم لوگوں کے نفس کی کیفیت کی بنیاد پر ان کو ذمہ داریاں سپرد کرتے ہیں؛ معاشرتی سطح پر بھی اور ریاستی سطح پر بھی۔ جمہوریت اس معاشرتی درجہ بندی کی نفی ہے؛ معاشرتی سطح پر بھی اور ریاستی سطح پر بھی۔ وہ کہتی ہے، نہیں سب برابر ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص کی نفسی کیفیت کیا ہے؟ اس کا حال کیا ہے؟ اس کا مقام کیا ہے؟ اس کی روحانی وسعت کیا ہے؟ اس کی دینی علوم تک کتنی رسائی ہے؟ اللہ کی مرضی کا کتنا تابع ہے؟ یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ اس کا معاشرتی اور ریاستی عمل سے کوئی تعلق نہیں، اسی لیے ہر جمہوری نظام میں جو بنیادی چیز ہوتی ہے وہ ہوتی ہے دستور۔

جمہوری ریاست میں دستور کتاب اللہ کا متبادل بن جاتا ہے

دستور ہی کے اردگرد یہ مساوی آزادی مرتب کی جاتی ہے اور دستور اصل میں کتاب اللہ کی جگہ لیتا ہے۔ سب سے پہلا دستور جو بنا وہ امریکا کا دستور تھا۔ ۱۷۸۰ء کے دورانیے میں فیڈرلسٹ پیپرز مرتب ہوئے اور اس کے بعد دستور بنا۔ اس نے فی الواقع صریحاً انجیل کی جگہ لی۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں جمہوریت قائم ہوئی خواہ وہ مذہبی ریاستیں تھیں یا اسلامی حکومتیں،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان سب نے دستور کی بالادستی قبول کی اور عملاً ان تمام اسلامی و نظریاتی ریاستوں میں دستور نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی۔ اصل میں دستور کی اہمیت کیوں ہے؟ اس لیے کہ دستور ہی کے ذریعے یہ مساوی آزادی (Equal Freedom) ممکن بنائی جاتی ہے۔ مساوی آزادی کے تصور کو سمجھنا نہایت اہم ہے اور مساوی آزادی کے تصور کو رد کیے بغیر احیائے اسلامی کا کام معاشرتی اور ریاستی سطح پر منظم کرنا ناممکن ہے۔

جمہوری معاشرے میں تعلقات کی بنیاد غرض ہے

اب میں جمہوری معاشرے اور جمہوری ریاست کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جمہوری معاشرہ ہم اس معاشرے کو کہہ سکتے ہیں جہاں وہ صفات عام ہوں جن کے نتیجے میں سرمایے کے ارتکاز کو اور سرمایے کی بڑھوتری کو تقویت ملے۔ جمہوری معاشرہ وہ معاشرہ ہے جہاں تمام تعلقات کی بنیاد غرض پر ہوتی ہے۔ ان معنوں میں جمہوری معاشرے کو ''سول سوسائٹی'' کہتے ہیں اور ''سول سوسائٹی'' مذہبی معاشرے کی نفی ہے۔ ''سول سوسائٹی'' جب یورپ میں وجود پذیر ہوئی تو اس نے مذہبی معاشرہ ختم کیا، عیسائی معاشرت کو ختم کیا۔ عیسائی معاشرت اور ''سول سوسائٹی'' میں کیا بنیادی فرق تھا؟ یہ بنیادی فرق تھا کہ عیسائی سوسائٹی محبت اور صلہ رحمی پر قائم تھی۔ جب کہ ''سول سوسائٹی'' معاہدے، فائدے، حرص و حسد اور غرض کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

''سول سوسائٹی'' اور مذہبی معاشرے کا فرق

عیسائی معاشرت صلہ رحمی اور محبت پہ قائم تھی اور عیسائی معاشرے یا مذہبی معاشرے کی جو بنیادی صف بندی ہوتی ہے وہ صلہ رحمی اور محبت کی بنیاد پر ہوتی ہے، انفاق اور قربانی دینے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ''جمہوری سوسائٹی'' یا ''سول سوسائٹی'' کی بنیاد کنٹریکٹ پر ہوتی ہے۔ کنٹریکٹ سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اپنے لیے جو خاص مقاصد متعین کیے ہیں ان کے حصول کے لیے دوسرے کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کریں جس کے نتیجے میں وہ آپ کو ان مقاصد کے حصول میں مدد دے۔ چناں چہ آپ اس سے محبت نہیں کرتے بل کہ آپ کی ایک باہمی غرض ہوتی ہے۔ ایک غرض آپ کی اور اس کی بھی ایک غرض ہوتی ہے اور ان دونوں اغراض کو حاصل کرنے کے لیے آپ ایک محدود تعاون کرتے ہیں اس تعاون کے نتیجے میں آپ ایک دوسرے کو استعمال کر کے اپنی ذاتی اغراض کو حاصل کرتے ہیں۔ پورا معاشرہ اسی خودغرضانہ تعاون کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ ''مارکیٹ'' ایک استعماری مظہر ہے کیوں کہ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہر تعلق کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور بنیادی طور پر ''سول سوسائٹی'' ''مارکیٹ سوسائٹی'' ہی ہوتی ہے اور ''سول سوسائٹی'' کے اندر خود غرضانہ تعاون و معاہدے اور اغراض کی جستجو کے سوا کوئی دوسرا کام کرنے کی وقعت نہیں رہتی۔ اضافی قدر (relative value) کا تعین اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کو کس حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ریاست کا بھی یہی ایک بنیادی فریضہ ہوتا ہے کہ معاہدوں کا نفاذ (Enforcement of Contracts) کرے۔ ریاست بھی ظاہر ہے ایک جمہوری ریاست ہوتی ہے۔ جمہوری ریاست کا جمہوری معاشرے سے گہرا تعلق ہے۔

جمہوری معاشرے اور مذہبی معاشرے کا فرق

جمہوری معاشرہ جمہوری ریاست کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جمہوری معاشرے اور مذہبی معاشرے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جمہوری معاشرے میں تعلقات کی بنیاد غرض کی تکمیل ہوتی ہے۔ مذہبی معاشرے میں تعلقات کی بنیاد صلہ رحمی اور محبت پر ہوتی ہے۔ مذہبی معاشرے کی خصوصیت یہ ہے کہ غیر کو اپنایا جاتا ہے، یہی محبت ہے۔ صلہ رحمی ہے غیر کو اپنانا۔ ''سول سوسائٹی'' میں بہ قول سارتر کے Hell is other people، غیر غیر ہی رہتا ہے۔ اپنے کچھ خاص مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔

سرمایہ دارانہ معاشرے نے کیا اقدار دیں؟

جب یورپ میں اس قسم کا معاشرہ قائم ہوا (اٹھارویں صدی سے یہ عمل شروع ہوا)، اس وقت جو سرمایہ دارانہ معاشرہ تھا غرض کی بنیاد پر قائم شدہ معاشرہ، یہ صرف چند شہروں میں تھا۔ نیپلز میں، فلارنس میں اور اٹلی کے کچھ شہروں میں۔ سوئٹزرلینڈ میں کہیں کہیں بہ حیثیت مجموعی جو یورپین معاشرہ تھا وہ عیسائیت کے زیر اثر تھا۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ (سول سوسائٹی) بہت دھیرے دھیرے پھیلا۔ اس کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر اور پھر ملک بنے اور اس کے بعد یورپ میں بہ حیثیت مجموعی اور پھر یورپ کی نو آبادیات میں یہ معاشرہ پھیل گیا۔ تو ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں کون سے اخلاق نے فروغ پایا؟ کن اوصاف نے فروغ پایا ہے؟ تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس اخلاق نے فروغ پایا وہ حرص و حسد اور شہوت و غضب کے جذبات تھے۔ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اس تبدیلی کے بعد عملاً جن اقدار نے فروغ پایا وہ اقدارِ رذیلہ تھے، اور وہ حرص و حسد اور طمع اور شہوت و غضب اور فرعونیت اور خود غرضی ہی تھے اور کچھ اور نہیں تھے۔ یہی یورپ کی تاریخ ہے۔ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

اگر ان بنیادوں پر آپ نے دوسرے ممالک میں معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تو اس جنسی بے راہ روی، اس اخلاقی پس ماندگی اس زبوں حالی اس نفس کی غلاظت و کثافت کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ آپ برآمد کر پائیں گے؟ اس کی کیا کوئی دلیل ہے، کوئی منطق ہے جو یہ کہہ سکے کہ یورپ میں جو ہوا وہ ہمارے ہاں نہیں ہوگا؟ ہم اپنے ہاں ایک ''سول سوسائٹی'' قائم کر دیں گے لیکن اس ''سول سوسائٹی'' کے قیام کے نتیجے میں اولیاء اللہ کی بہتات ہوگی، اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے نہ منطقی۔ ظاہر ہے کہ وہی اخلاق پیدا ہوئے جن اخلاق کا پیدا ہونا اور غالب آنا سرمایے کی بڑھوتری کے لیے ضروری تھا۔ سرمایے کی بڑھوتری اور حرص و حسد کا فروغ پانا ایک چیز کے دو نام ہیں کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ سرمایہ نام ہی اس کا ہے کہ حرص و حسد فروغ پائیں اور سرمایہ قلب کو مسخر کرے۔ سرمایہ یہی چیز ہے اس کے علاوہ سرمایہ کچھ نہیں اس کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

سرمایے کی اصل حیثیت: اخلاقی گراوٹ

اس وقت سرمایے کی جو شکل ہے وہ فنانس ہے اور فنانس کی کوئی حیثیت نہیں۔ محض کمپیوٹر کی میموری کے اندر کچھ نکات (Dots) ہیں۔ اس کی اصلی حقیقت یہی ہے کہ وہ حرص و حسد ہے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت آپ اپنی مجموعی کاوش کا مقصد حرص و حسد کی عمومیت قرار دیں تو معاشرے میں جو اخلاق فروغ پائیں گے وہ یہی اخلاق فروغ پائیں گے۔ آپ جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے۔ جن معاشروں نے اپنے آپ کو سرمایہ داری اور سرمایہ داروں اور استعمار کے سپرد کر دیا وہاں وہ تمام اخلاق رذیلہ اور وہاں یہ تمام خباثتیں پیدا ہو گئیں۔ جنسی بے راہ روی، حرص و حسد، طمع اور خود غرضی وغیرہ وغیرہ کہ جو یورپ میں اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں پیدا ہوئیں تمام نو آبادیات میں پیدا ہوئیں۔ آج آپ دیکھیں تھائی لینڈ، فلپائن اور ہندستان میں ایڈز کی وبا ہے، یہ کس وجہ سے آئی؟ اس وجہ سے آئی کہ انھوں نے اپنے آپ کو سرمایہ داری اور استعمار کے سپرد کر دیا۔ جو بھی ملک اور معاشرہ اپنے آپ کو سرمایے کے سپرد کرے گا اس کے اندر معاشرتی سطح پر اخلاقی گراوٹ آنا لازم ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد ہو۔ لہٰذا ''سول سوسائٹی'' کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کرنا اور بڑی سادگی سے یہ کہنا کہ نہیں ''سول سوسائٹی'' کے اندر انسان کو بہت سے حقوق ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اس کی اسلام میں اجازت ہے؛ مغربی فکر، فلسفے، تاریخ معاشروں سے ناواقفیت پر مبنی نقطہ نظر ہے۔ ایسا نقطہ نظر اختیار کرنا فی الواقع ''سول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سوسائٹی'' کے قیام کے نتیجے میں معاشرے پر اور افراد کی ذاتی زندگی پر جو اثرات ہوتے ہیں ان سے سہوِ نظر کرنا ہے اور اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ ہم ''سول سوسائٹی'' کے قیام کے قائل نہیں ہیں بل کہ یقیناً ہم ''سول سوسائٹی'' کو تاریخی گم راہی اور طاغوت سمجھتے ہیں اور اس بات کی کوشش کریں گے کہ اسلامی معاشرتی اور ریاستی صف بندی ہو جس میں اہلِ تقوا اور اہل اللہ کی سیادت کو مستحکم کیا جائے اور اہل اللہ اور اہلِ تقوا کی سیادت کو معاشرے اور ریاست کی ہر سطح پر تسلیم کیا جائے اس کو قائم کرنا اخلاقِ حمیدہ کے فروغ کے لیے لازم ہے۔ اگر سیادت اور قیادت علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے ہاتھ سے نکل کر کسی دوسرے طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی تو یہ معاشرے، ریاست اور فرد کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علما کرام انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں۔ معاشرے اور ریاست کی ہر سطح پر قیادت کا منصب صرف علما کرام کا منصب ہے اس لیے کہ جب علما کرام کو اس سیادت و قیادت سے محروم کیا گیا اور سیادت و قیادت دوسرے افراد کے ہاتھ میں دی گئی تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں جو چیز پھیلی وہ اخلاقِ رذیلہ اور منکرات تھے۔ لہٰذا ''سول سوسائٹی'' کو رد کرنا اور اس معاشرتی صف بندی کو رد کرنا جو جمہوری نظام کا خاصہ ہے، لازم ہے۔ آج ''سول سوسائٹی'' قائم کرنے کے لیے جو کوششیں نظر آتی ہیں ان کا بھی میں اختصار کے ساتھ تذکرہ کر دوں۔

''سول سوسائٹی'' اور این جی اوز

''سول سوسائٹی'' قائم کرنے کے لیے جو بنیادی ایجنسی آج کی دنیا میں موجود ہے اسے ''این جی او'' کہتے ہیں۔ اس این جی او کی تحریک کے پیچھے استعمار کا ہاتھ ہے۔ این جی اوز کا مقصد بنیادی طور پر معاشرے کو غرض (Interest) کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہے۔ صلہ رحمی کی بنیاد پر جو فطری صف بندی معاشرے میں موجود ہے اس کو ختم کر کے غرض کی بنیاد پر ''سوسائٹی'' کو دوبارہ منظم کرنا تاکہ انسان بنیادی طور پر کسی خاص غرض کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے اور اس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر جو تحریکات یا موومنٹس اٹھتی ہیں انہیں ہم کہتے ہیں

Foucauldian Movements۔

Foucauldian تحریکیں یا سنگل ایشو موومنٹس

Foucauldian Movements کیوں؟ اس لیے کہ فوکالٹ ایک بااثر فرانسیسی پوسٹ ماڈرنسٹ فلسفی تھا جو ۱۹۸۴ء میں ایڈز سے ہلاک ہوا، کہتا تھا کہ سرمایہ دارانہ شخصیت (Subjectivity) آزادی کے حصول کا ذریعہ ہے لیکن سرمایہ دارانہ شخصیت (Subjectivity) کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے آپ کو سرمایے کے سپرد کر دینے کا عمل اس چیز کا متقاضی ہے کہ آپ متعین غلبے (Specific dominations) کو رد (resist) کرتے رہیں۔ آپ خالص کسی ایک ایشو کو لے کر اپنی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔ کسی ایک مسئلہ پر مثلاً پانی نہیں آ رہا، تمام لوگوں کو اس بات پر متحد کیا جائے کہ پانی لاؤ، تعلیم نہیں مل رہی تمام افراد کو اس چیز پر متحد کیا جائے کہ تعلیم حاصل کی جائے۔ کوئی بھی سنگل ایشو موومنٹ اس پورے خاکے کو چیلنج نہیں کرتی کہ تعلیم حاصل کر کے اور پانی کا حصول ممکن بنا کر تم بہ حیثیت مجموعی کس نظام کا غلبہ چاہتے ہو؟ اس بڑے سوال کو اٹھائے بغیر ان سنگل ایشو موومنٹس کے ذریعے حصولِ عدل کو سرمایہ دارانہ نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکے کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ وسعت موجود ہے جس کے نتیجے میں ہم ان سنگل ایشوز کا حل اس طریقے سے حاصل کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ حکمتِ عملی بہ حیثیت مجموعی مستحکم ہو۔ اسے ہم کہتے ہیں Foucauldian تحریک۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن جو بات اچھے طریقے سے سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ غیر حکومتی تنظیمیں (این جی اوز) استعمار کی وہ ایجنسیاں ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں کی خودغرضیوں کو بنیاد بنا کر سرمایہ دارانہ نظام کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ان خودغرضیوں کی جدوجہد اور ان خودغرضیوں کے حصول کے لیے جو تگ و دو وہ کرتے ہیں اس کا حصول عدل کے ذریعے کے طور پر معاشرتی سطح پر جواز (Legitimation) پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو قبول کیا جائے کہ بنیادی طور پر سنگل ایشو موومنٹس پانی لانے کی تحریک یا تعلیم کو عام کرنے کی تحریک یا عورتوں کو آزاد کرنے کی تحریک نہیں، یہ وہ تحریکات ہیں جن کے نتیجے میں فی الواقع لوگ آزاد ہو جاتے ہیں، ان کو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو بنیادی معاشرتی گراوٹ اور بنیادی معاشرتی اخلاقی رذائل کا پھیلاؤ ہے اس سے سہوِ نظر کر کے عوام کو اس سے مانوس کر کے ان کو اس بات کی طرف ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ان سنگل ایشوز کو حل کرنے کے لیے اپنی تمام تر روحانی اور جذباتی وابستگیاں اس عمل کے ساتھ منسلک کریں اور سمجھیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ عدل قائم کرتا ہے۔ انھی معنوں میں کہ وہ ان کو ان کے جو کچھ بھی جائز مسائل ہیں ان کے حل کے لیے منظم ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اس طرح فرد کی توجہ اہم مسائل اور سوالات سے ہٹ کر صرف ایک چھوٹے سے مسئلے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور یہی مسئلہ فرد کی اور کسی تحریک کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مغربی اور مذہبی معاشرت کا فرق

سرمایہ دارانہ معاشرتی صف بندی کو چیلنج کرنے کی خاطر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم سرمایہ دارانہ معاشرت کی روح اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی کلیت کو متنازع فیہ بتائیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کو بہ حیثیت ایک عقلیت کے متنازع فیہ بتائیں اور ہماری تحریکات ''سنگل ایشو موومنٹس'' نہ ہوں اور ''سنگل ایشو موومنٹس'' کا جواز نہ پیش کریں۔ بل کہ ''سنگل ایشو موومنٹس'' کو معاشرتی صف بندی کے عمل میں کلیدی کردار ادا کرنے سے روکیں اور ان کو یہ بات باور کرائیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کو بہ حیثیت ایک نظام کے رد کیے بغیر وہ ظلم اور وہ اخلاقی رذائل جو اس نظام کو قائم کرنے کے نتیجے میں معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تحریکاتِ اسلامی اور غلبۂ دین کی تحریکیں معاشرتی صف بندی کی جو حکمتِ عملی اختیار کرتی ہیں اس حکمتِ عملی کی دو خصوصیات ہونی چاہییں:

ایک یہ کہ وہ اس معاشرتی صف بندی کا احیا کرنا چاہتی ہیں کہ جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہر سطح پر، محلے کی سطح پر، بازار کی سطح پر، شہر کی سطح پر، صوبے کی سطح پر، ملک کی سطح پر غرض کہ ہر سطح پر قیادت کی ذمہ داری علمائے کرام اور صوفیائے عظام سنبھالیں۔ قیادت کا منصب ان کا منصب ہے اور معاشرتی صف بندی کی تشکیل ان کی ذمہ داری ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہماری تحریکات ''سنگل ایشو موومنٹس'' نہیں ہوتیں۔ ہم سوشل ورک نہیں کرتے۔ ہماری تحریکات بنیادی طور پر اس عقلیت کو اکھاڑ پھینکنے کی تحریکیں ہیں جو دنیوی زندگی میں لذت کے حصول کو زندگی کا مقصد قرار دیتی ہے اور جس کے نتیجے میں وہ اخلاقِ رذیلہ پھیلتے ہیں جو یورپ اور امریکا میں جہاں بھی مغربی تہذیب نے غلبہ حاصل کیا وہی اخلاق رذیلہ پھیلے۔ انھی معنوں میں ہم اپنی معاشرت کو مغربی معاشرت کا متبادل سمجھتے ہیں۔ مغربی معاشرت کے اندر ہماری معاشرت نہیں پنپ سکتی۔ مغربی معاشرت کے اندر اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں اور یہ بات عیسائیت کے المیے سے ہم پر واضح ہے۔ عیسائیت کے بارے میں عرض کروں گا بالخصوص علما کرام کی خدمت میں کہ اس وقت غیر اسلامی تحریکوں کے بارے میں علما کی توجہ عیسائیت اور یہودیت پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے زیادہ تر علما کرام اور صُوفیا جب غیر اسلامی تحریکات پر غور فرماتے ہیں تو ان کا مطمحِ نظر عیسائیت یا یہودیت ہوتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امت مسلمہ کا عیسائیت سے کوئی مقابلہ نہیں

عیسائیت کے بارے میں ہم یہ بات مکمل یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ عیسائیت تو فنا ہو چکی ہے۔ عیسائیت سے ہمارا اس وقت کوئی مقابلہ نہیں، مقابلہ مغرب سے ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی فکر نے اور عیسائی روحانیت نے مغربی تہذیب کی نشوونما میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے لیکن اس وقت جو مدِ مقابل ہے وہ تہذیب مغرب ہے۔ Enlightenment (تحریکِ تنویر) اور Romanticism (تحریکِ رومانویت) سے ہمارا مقابلہ ہے۔ عیسائیت سے ہمارا مقابلہ نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے علما اور اہلِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عیسائیت کے مباحث سے صرفِ نظر فرمائیں اور تحریکِ تنویر اور تحریکِ رومانویت نے معاشرتی، علمی اور ریاستی سطح پر جو خطرات پیش کیے ہیں ان کا محاکمہ فرمائیں اور ان کے اسلامی رد کے لیے وہ علمیاتی حکمتِ عملی تیار کریں جس کے نتیجے میں مغربی فکر، تہذیب اور فلسفے کا وقیع تنقیدی محاکمہ پیش کیا جاسکے۔

سرمایہ دارانہ ریاست

سرمایہ دارانہ ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت پیدا کرے جو اپنے آپ کو آزادی کے سپرد کر دے۔ سرمایہ دارانہ ریاست کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت کی تعمیر اور اس کی مستقل تخلیق کو ممکن بنائے جس کے اندر دو خصوصیات ہوں: ایک تو یہ کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی اس نظم و ضبط کو قبول کرے جس کو قبول کیے بغیر آزادی کے زیادہ سے زیادہ اضافہ کو ممکن بنانے کا عمل ناممکن ہے۔ یعنی ایک ایسی شخصیت کا وجود اور ایک ایسی شخصیت کی ری پروڈکشن، ایک ایسی شخصیت کی مستقل تخلیق جو اس بات کو قبول کرے کہ زندگی میں میرے وجود کی ضامن یہی بات ہے کہ میں کتنا زیادہ اس بات کے قابل ہو سکتا ہوں کہ میں جو چاہوں وہ کروں۔ اس قسم کی شخصیت خود بہ خود پیدا نہیں ہوتی جو اپنے اوپر آزادی کو خیرِ مطلق کے طور پر مسلط کرے۔ اس شخصیت کو فروغ دینے کے لیے ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے، ایک جبر کی ضرورت ہوتی ہے وہ قانون اور وہ جبر جمہوری ریاست فراہم کرتی ہے۔

جبر کے بغیر انسان آزادی کا طلب گار نہیں ہوتا

پہلی ضرورت جمہوری ریاست کے وجود کی یہ ہے کہ انسان جبر کے بغیر خود بہ خود فطرتاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آزادی کی بڑھوتری کو مقصدِ زندگی کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ چناں چہ ہر دستور میں بالخصوص امریکی دستور میں جس چیز کو مقدس گائے کے طور پر رکھا گیا ہے اور جس کو جمہوری عمل سے ماورا کی حیثیت دی گئی ہے وہ ہیں حقوقِ انسانی۔ حقوقِ انسانی کیا ہیں؟ حقوقِ انسانی دراصل وہ ذرائع ہیں جن کے بغیر سرمایے کی بڑھوتری کے فرض کو فرداً انہیں کر سکتا۔

حقوقِ انسانی کو اگر جمہوری عمل کے ماتحت کر دیں تو اس کا امکان بھی موجود ہے کہ حقوقِ انسانی کو رد کر دیا جائے۔ امریکی دستور جس وقت بننے لگا تو بالخصوص وہ مفکرین جنھوں نے فیڈرلسٹ پیپرز لکھے تھے، ہیملٹن اور میڈے سن، انھوں نے کہا کہ بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ایک اقلیت کے اوپر ایک اکثریت ایسے قانون مسلط نہ کر دے جو حقوقِ انسانی کے فروغ کو ملک میں ممکن نہ بنائیں۔ چناں چہ امریکی دستور کے اندر اور اس کے بعد جتنے دساتیر لکھے گئے ہیں سب کے اندر جو بنیادی اعتقاد ہے حقوقِ انسانی کا ہے۔ گویا حقوقِ انسانی ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اکثریت کو بھی اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ حقوقِ انسانی کو رد کرے۔ ان حقوق کو ماننا، تسلیم کرنا اور ان کے لیے سہولتیں مہیا کرنا ہر ایک کا فرض ہے اور جو اس فرض کی راہ میں حائل ہوگا کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائے گا۔

حقوقِ انسانی، پختہ مذہبی عقیدہ

حقوقِ انسانی کے منشور کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پختہ مذہبی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ حقوقِ انسانی دستور کا دیباچہ ہیں جس کے نتیجے میں فرد کو اس بات کا مکلف بنایا جاتا ہے کہ وہ چند چیزوں کے معاملے میں خودمختار ہے مثلاً یہ کہ وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا کیا رائے رکھے گا؟ وہ رائے کا اظہار کس طریقے سے کرے گا اور سب سے اہم یہ کہ وہ سرمایہ دارانہ ملکیت کا تابع بنا دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ملکیت اور اس کے جتنے بھی مضمرات ہیں حقوقِ انسانی کی تفصیل کے ضمن میں بیان کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا شخصیت کو اس طریقے سے تعمیر کرنا کہ وہ آزادی کو زندگی کا مقصدِ اولیٰ تصور کرے اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے اس جبر کو قبول کرے جو حقوقِ انسانی کو ادارتی شکل دینے کے لیے کسی معاشرے میں ضروری ہوتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ جمہوری ریاست کا اولین فرض ہے اور اس فرض اولین کو ادا کرنے کے لیے فلسفہ حقوقِ انسانی کو سرمایہ دارانہ اور لبرل دستور کے دل کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ چناں چہ ہر جمہوری نظام کے اندر ریاست کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ بنیادی حقوق کو دیگر تمام حقوق سے بالاتر تصور کرے۔ اس لیے آج استعمار اس بات کا داعی ہے کہ ہر اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ملک میں جہاں اس کے مرتب کردہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے وہاں وہ عسکری مداخلت کرے اور اقوام متحدہ کی امن فورسز اور سلامتی کونسل نے اپنا یہ کردار امریکا اور دیگر قوتوں سے منوالیا ہے کہ فی الواقع بنیادی حقوق عالم گیر قانون ہیں۔ اور بنیادی حقوق کیا ہیں؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرمایے کی بڑھوتری کی فرضیت کو ادا کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت انفرادی طور پر ہوتی ہے وہ بنیادی حقوق ہیں۔ ان کو عالمی قانون کے طور پر نافذ کرنا' اور عالمی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرانا جمہوری ریاست کا اولین فرض ہے۔

حقوقِ انسانی سے بالاتر کوئی شے نہیں

اگر جمہوری عمل کے نتیجے میں اس چیز کا خطرہ پیدا ہو کہ بنیادی حقوق سے بالاتر کسی قانون کو بہ حیثیت ایک نافذ قانون کے طور پر مان لیا جائے تو جمہوری عمل کو معطل کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے سب سے اہم مثال الجیریا کی ہے۔ الجیریا میں فی الواقع ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں انتخابات کے ذریعے اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ایک ایسی حکومت قائم ہو گی جو شریعت کو بنیادی حقوق اور دیگر قوانین سے بالاتر حیثیت دے گی۔ لہٰذا فرانس اور امریکا کی مدد سے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ تو یہ کوئی حادثاتی بات نہیں خود مغربی مفکرین کے ہاں بھی۔ بالخصوص اس وقت مغرب کا سب سے بڑا سیاسی مفکر جان رالس ہے اس کی کئی کتابیں ہیں، اس کی مشہور کتاب جو ۱۹۹۵ء میں چھپی، جس کا نام سیاسی لبرل ازم (Political Liberalism) ہے، وہ اس کتاب میں کہتا ہے کہ اگر حقوقِ انسانی کو معطل کرنے کی تحریکیں اٹھیں تو آپ ان کو ایسے ہی تصور کریں جیسے وبا ہوتی ہے، جیسا کہ طاعون۔ اسے ایک وبا کے طور پر تصور کریں اور بالکل جس طریقے سے وبا کو ختم کرنے کے لیے ہر عمل جائز ہے اسی طریقے سے ان تحریکوں کو بھی ختم کرنا جائز ہے۔ تو الجیریا میں جو کچھ ہوا وہ کوئی حادثاتی نہیں تھا۔ سرمایہ دارانہ عقلیت اسی عمل کی متقاضی ہے۔ افغانستان کو بھی اسی لیے تباہ کیا گیا کہ اس نے دستوری اور جمہوری ریاست کا ڈھانچہ قبول نہیں کیا اور ایک متوازی ریاست بننے کی کوشش کی۔

جمہوریت آزادی کے حصول کا ذریعہ ہے

جمہوریت یا انتخابات تو ایک ذریعہ ہیں آزادی کی بڑھوتری کے لیے، یہی تو انتخابات اور جمہوریت کا مقصد ہے اور اگر اس کے ذریعے وہ نتیجہ نہ نکلے تو ظاہر ہے کہ بنیادی حقوق کے نفاذ کا عمل معطل ہو جائے گا۔ جو مقصود اور مقدم ہے اور اس مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حادثاتی ہے، طریقہ دوسرا بھی ہوسکتا ہے۔ تو اگر انتخابی عمل کے ذریعے کبھی یہ امکان پیدا ہوا کہ بنیادی حقوق کو منسوخ کیا جائے یا بنیادی حقوق کے اوپر اور بالاتر کوئی قانون نافذ ہونے کا احتمال ہوا تو ان انتخابات اور اس جمہوری عمل کو فی الفور کالعدم کر دیا جائے گا۔ یہ سرمایہ داری کے عالمی غلبے کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انتخابات کے ذریعے بنیادی حقوق سے بالاتر کوئی دوسرا قانون نافذ کیا جائے اور استعمار اسے قبول کرے، استعمار اس پر مجبور ہے کہ اسے ختم کرے۔ استعمار منطقی طور پر اس پر مجبور ہے کہ اسے ختم کرے اس کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔ جو لوگ اس سے سہوِ نظر کرتے ہیں یا تو وہ استعمار اور سرمایہ داری کی حقیقت سے واقف نہیں یا پھر فی الواقع مغربی تہذیب کے اندر اسلام کو ضم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے مسلم مفکرین کی یہ تمام تعبیرات کہ اسلام میں بھی انسانی حقوق کا تصور موجود ہے اور اسلام میں بھی سرمایہ داری کا ایک تصور موجود ہے؛ اسلامی معیشت یہی کہتی ہے وغیرہ یہ تمام تصورات یا تو کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں یا سرمایہ داری کی اصلیت کے بارے میں ناواقفیت کا ثمر۔ یا پھر فی الواقع اسلام کو مغربی تہذیب کا ایک حصہ تصور کرنے کا نتیجہ ہیں۔ یہ وہی دلیل ہے جو ہمارے معذرت خواہ بیسویں صدی کے شروع میں اور انیسویں صدی کے آخر میں امیر علی، چراغ علی اور سر سید احمد خان دیا کرتے تھے کہ اصل میں تو مغربی تہذیب اسلام ہی سے نکلی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بات کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے کہ سرمایہ دارانہ ریاست اور جمہوری ریاست ایک ہی چیز ہے دو چیزیں نہیں ہیں۔ جمہوری ریاست کا مقصد سرمایے کی بالا دستی کو قائم کرنے کے سوا کچھ نہیں، باقی تو طریقہ کار ہے۔ انتخابات ایک طریقہ کار ہے، جمہوریت یا جمہوری پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ یہ طریقہ کار ہیں۔ مقصد صرف آزادی کی بڑھوتری ہے، سرمایے کی بڑھوتری ہے۔ اور آزادی اور سرمایے کی بڑھوتری میں اگر جمہوری عمل، انتخابات کا عمل، پارلیمنٹ کا عمل، عدلیہ کا عمل مانع ہو تو ظاہر ہے کہ وہ معطل کر دیا جائے گا۔ اور اصل مقصود یعنی سرمایہ داری بذریعہ بنیادی حقوق کے حصول کے لیے عالمی سرمایے کی بالادستی مسلط کر دی جائے گی تاکہ نظام کو بہ حیثیت نظام کے خطرہ نہ ہو۔

سرمایے کی عمومی حفاظت ریاست کے ذریعے

ریاست کا ایک اور فریضہ جس پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں یہ ہے کہ وہ سرمایے کے عمومی مفاد کی محافظ ہے، سرمایے کی بڑھوتری کے عمل میں ایک تضاد ہے۔ وہ تضاد یہ ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری کا عمل مسابقت سے ہوتا ہے۔ فورڈز کمپنی، کرائسلر کمپنی کے خلاف جدوجہد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرلی ہے اور اگر فورڈ کمپنی کا منافع بڑھے تو کرائسلر کمپنی کا منافع کم ہوتا ہے۔ سرمایہ مسابقت کے ذریعے بڑھتا ہے، چاہے یہ مسابقت سٹے کی مارکیٹ میں ہو چاہے وہ ذرائع پیداوار کی مارکیٹ ہو چاہے وہ فنانشل مارکیٹ ہو، مسابقت جو ہوتی ہے وہ متعین سرمایہ میں ہوتی ہے۔ متعین سرمایہ کیا ہے؟ متعین سرمایہ کمپنیاں ہیں، کارپوریشنیں ہیں۔ کارپوریشن چاہے فنانشل شکل میں ہو چاہے پیداواری شکل میں ہو چاہے خدمت (Service) کی شکل میں ہو۔ متعین سرمایہ کی شکل کارپوریٹ شخصیت ہے۔ مسابقت جو ہوتی ہے متعین سرمایہ کو بڑھانے کی مسابقت ہوتی ہے۔ سرمایہ بہ حیثیت مجموعی کیسے فروغ پا سکتا ہے؟ کسی کی براہِ راست توجہ اس طرف نہیں ہوتی جو لوگ سرمایے کو عملاً بڑھا رہے ہیں، جو لوگ مارکیٹ میں موجود ہیں اور سرمایے کے فروغ کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی دل چسپی اپنے خاص سرمایے کی بڑھوتری سے ہوتی ہے۔ عمومی سرمایے کی بڑھوتری سے ان کی دل چسپی نہیں ہوتی۔ چناں چہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کی مسابقت کے نتیجے میں ان کا ذاتی سرمایہ تو بڑھے لیکن جو حکمتِ عملی وہ اپنا رہے ہیں اس کے نتیجے میں سرمایہ عمومی طور پر نہ بڑھے۔ سرمایہ اس طرف چلا جائے جس طرف اس کے بڑھنے کے عمومی امکانات کم ہیں تو ریاست کا ایک بہت بڑا کام، سرمایہ دارانہ ریاست اور جمہوری ریاست کا ایک بہت بڑا وظیفہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی مجموعی حکمت عملی مرتب کرے جسے کہتے ہیں میکرو اکنامک پالیسی اور اس کے تین شعبے ہیں تاکہ سرمایہ میں بہ حیثیت مجموعی اضافہ ہوتا رہے کسی خاص گروہ کے لیے سرمایہ مخصوص نہ ہو جائے۔

۱۔ زری پالیسی (Monetry Policy)

۲۔ تجارتی پالیسی (Commercial Policy)

۳۔ مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy)

ان تینوں پالیسیوں کے نفاذ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری بہ حیثیت مجموعی مستحکم کی جائے اور متعین سرمایہ کے درمیان مسابقت کو اس طریقے سے مرتب کیا جائے کہ اس کے نتیجے میں سرمایہ بہ حیثیت مجموعی بڑھتا رہے۔ زری پالیسی، مالیاتی پالیسی اور تجارتی پالیسی، یہ تینوں چیزیں ہر سرمایہ دارانہ ریاست کے وظائف میں شامل ہیں۔ اور ان تینوں پالیسیوں کو اختیار کر کے سرمایہ دارانہ ریاست یا جمہوری ریاست اپنا یہ فرض ادا کرتی ہے کہ کارپوریشنوں کے درمیان جو مسابقت ہے اس کو اس طریقے سے مرتب کرے کہ مجموعی سرمایے کے اضافے اور بڑھوتری کی رفتار میں کمی نہ آئے، مجموعی بڑھوتری کے امکانات روشن رہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قومی سرمایہ اور عالمی سرمایہ

اب یہاں سے ہمیں قومی سرمایے اور گلوبل سرمایے کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ہونے کا امکان نظر آتا ہے۔ عموماً سرمایہ دارانہ ریاستی صف بندی یا سرمایہ دارانہ سیاسی صف بندی قومی ریاست کی سطح پر ہوتی ہے۔ ہر ریاست کی میکرو اکنامک پالیسی ہوتی ہے، ہر قومی ریاست کی مالیاتی پالیسی ہوتی ہے، زری پالیسی ہوتی ہے، تجارتی پالیسی ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں سرمایے کی عمومی بڑھوتری کا تحفظ کیا جا سکتا ہے اور اس طرح عمومی سرمایے کی بڑھوتری کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کام قومی ریاستوں کا ہے۔ مثلاً پاکستانی ریاست کی ایک مالی پالیسی ہے۔ پاکستانی ریاست کی ایک زری پالیسی ہے۔ سٹیٹ بنک زری پالیسی بناتا ہے پاکستانی ریاست کی تجارتی پالیسی ہے وغیرہ۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ سرمایہ تو اب قومی رہا نہیں۔ سرمایے کی بڑھوتری جس سطح پر ہوتی ہے وہ قومی سطح نہیں وہ تو بریٹن وڈ کا نظام تھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۸۰ء تک یہ صف بندی قائم رہی۔ اسی دور میں سرمایے کی عمومیت سے مراد قومی سرمایہ ہوتی تھی۔ مثلاً انگریز کا سرمایہ، امریکی کا سرمایہ، جاپان کا سرمایہ، جرمن کا سرمایہ وغیرہ۔ بریٹن وڈ نظام میں جب سرمایہ کی عمومی سطح پر گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد قومی سطح ہوتی ہے یعنی ریاست کا مقصد قومی سرمایہ کا تحفظ تھا۔ مالیاتی پالیسی کا احاطہ فورڈازم میں قومی سطح پر ہوتا تھا۔ اب کیا ہوا ہے؟ اب یہ ہوا کہ سرمایہ تو ہو گیا گلوبل، سرمایہ تو ہو گیا عالمی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سرمایے کی عمومی بڑھوتری کے تحفظ کا انتظام کیا جائے تو اس کو بھی عالمی سطح پر ہونا چاہیے کیوں؟ اس لیے کہ اب سرمایے کا مجموعی مفاد اس میں ہے کہ منافع عالمی سطح پر Maximise ہو سکے۔ سرمایے کی ترسیل پر تمام حد بندیاں ہٹ گئی ہیں اور ختم ہو گئی ہیں اور جب سرمایہ دار یہ کہتا ہے کہ مجھے منافع کو بڑھانا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے منافع کو اس چیز سے ماورا ہو کر بڑھانا ہے کہ یہ منافع پاکستان میں بڑھے گا یا انگلستان میں یا ٹوکیو اسٹاک ایکسچینج میں یا روس میں۔ میں تو بہ حیثیت مجموعی اپنے سرمایے سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتا ہوں، میں تو وہاں پیسہ لگاؤں گا جہاں سے زیادہ سے زیادہ منافع ہو۔ چناں چہ قومی سطح سے اوپر اٹھ کر وہ عالمی سطح پر پہنچ گیا ہے۔ اب جمہوری ریاست کا جو فریضہ ہے وہ یہ ہے کہ اس گلوبل سطح پر عمومی سرمایے کی بڑھوتری کا تحفظ کرے اور اس کو ممکن بنائے۔ قومی سطح پر یہ کام کرنا اب ممکن نہیں رہا اس لیے کہ سرمایہ اب عالمی ہو گیا ہے قومی نہیں رہا۔ اب جمہوریت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ گلوبل سطح پر یہ ریاست قائم نہیں کی جا سکتی گلوبل سطح پر جمہوری ریاست قائم نہیں ہو سکتی وہ کیوں نہیں قائم کی جا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سکتی اور امریکا اس موجودہ نظام میں ایک خاص کردار کیسے ادا کر رہا ہے اس پر پھر بات ہوگی۔

عالمی مالیاتی نظام سرمایے کا عالمی غلبہ

یہاں صرف اتنی بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آج بین الاقوامی مالیاتی نظام کا حصہ بننا عالمی سطح پر سرمایے کی بڑھوتری کے تقاضوں کو پورا کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ بین الاقوامی سطح پر جو بھی مالیاتی نظام ہے اس کا ایک حصہ بننا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس پر تیار ہیں کہ ہم بنیادی طور پر وہ نظم و ضبط قبول کریں گے جس نظم کو قبول کرنے کے نتیجے میں سرمایے کو عالمی سطح پر بڑھوتری کے عمل میں مدد دی جا سکے۔ لہٰذا قومی ریاستیں باستثنائے امریکا سرمایے کی بین الاقوامی تنظیم کے ماتحت ہوگئی ہیں۔ یہ جو تنظیم ہے یہ گلوبل نہیں ہے یہ بین الاقوامی ہی ہے یہ جو سرمایے کی پبلک سیکٹر کی تنظیم ہے یہ جو سرمایے کی ریاستی تنظیم ہے یہ نامکمل تنظیم ہے یہ بین الاقوامی ہی ہے۔ گلوبل نہیں ہے سرمایہ خود گلوبل ہے لیکن اس کی ریاستی تنظیم بین الاقوامی ہے۔ قومی ریاستیں اس بین الاقوامی تنظیم کے ماتحت کی جا رہی ہیں اور جمہوری عمل کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے قومی ریاستوں کا بین الاقوامی ہیئتوں (Structures) کے ماتحت ہو جانا اور اس کی بالا دستی کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر بین الاقوامی ریاستی ڈھانچے سے قومی ریاستیں لاتعلقی کا اظہار کر دیں تو وہ جمہوری ریاستیں نہیں رہ سکتیں۔ کن معنوں میں؟ ان معنوں میں کہ سرمایے کی عالمی بڑھوتری کو ممکن بنانے میں ان کا حصہ نہیں ہو سکتا اور اگر بین الاقوامی سطح پر نہیں ہو سکتا تو سرمایہ دارانہ نظام سے وہ کٹ گئیں، جمہوری نظام سے وہ کٹ گئیں لہٰذا آج قومی سرمایہ کوئی چیز نہیں۔ قومی ریاست یقیناً موجود ہے قومی سرمایہ کوئی چیز نہیں ہے اور قومی سرمایہ گلوبل سرمایے میں ضم ہو گیا ہے۔ قومی ریاست بین الاقوامی ریاست کے نظام کی ماتحت ہو گئی ہے۔ اسی چیز کو ہم سرمایے کا عالمی غلبہ اور تسلط کہتے ہیں۔ سرمایے کے عالمی غلبے اور تسلط سے مراد یہی ہے کہ قومی ریاست گلوبل سطح پر سرمایے کی بڑھوتری کے عمل کو اپنے اوپر حاکم تسلیم کر لے۔

پاکستان کی دو بڑی جمہوری جماعتیں ہیں لیکن ان کے پروگرام کا اگر آپ جائزہ لیں تو دو چیزوں کی مماثلت پائیں گے۔ اسی وجہ سے وہ دونوں اپنا وجود برقرار رکھ پاتی ہیں اور حکومت بھی کر سکتی ہیں۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ اول یہ کہ وہ دونوں اس چیز کی متقاضی ہیں کہ استعمار ان کی پشت پناہی کرے۔ استعمار سے وہ امداد کی طالب ہیں اور کن بنیادوں پر؟ انھی بنیادوں پر کہ وہ اس پروگرام کو جو استعمار کی بین الاقوامی تنظیمیں پاکستان پر مسلط کرنا چاہتی ہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس پروگرام کو وہ قبول کرتی ہیں وہ دونوں جماعتیں آئی ایم ایف کے جو اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام (Structural Adjustment) یا ورلڈ بینک کے جو معاہدے ہیں یا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تحت پاکستان کی جو یقین دہانیاں (Commitments) ہیں ان کو پورے کے پورے طور پر قبول کرتی ہیں اور معاشی حکمتِ عملی میں دونوں جماعتوں نے انٹرنیشنل آرگنائزیشنز کے، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک وغیرہ کے پروگرام کو پورے کے پورے طور پر قبول کرلیا ہے۔ استعماری معاشی پروگراموں کی قبولیت کے بارے میں ان میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔ دوسری بات جو ان دونوں جماعتوں میں مشترک ہے اور اس میں کوئی متنازعہ فیہ بات نہیں ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں جمہوری جماعتیں ہیں ان معنوں میں کہ وہ دونوں آزادی اور سرمایہ کی بڑھوتری چاہتی ہیں۔ دونوں کی تاریخ جمہوریت سے رقم ہے اور یہ دونوں جمہوری جماعتیں استعمار کی حلیف ہیں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے جمہوریت کا مقصد ہی سرمایے کی بڑھوتری بہ حیثیت مجموعی ہے۔ جمہوری جماعتیں آزادی کی خواہش مند ہیں وہ یہ نہیں کریں گی تو اور کیا کریں گی؟ اس لیے اس میں تعجب و استعجاب کی کوئی گنجایش نہیں کہ جمہوری جماعتیں استعمار کی حلیف ہیں۔ استعمار کیا چاہتا ہے؟ آزادی کی بڑھوتری، یہی تو وہ چاہتا ہے، یہی اس کا مقصد ہے اور یہی جمہوریت کا دوسرا نام ہے۔ تو اگر جمہوری جماعتیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے پروگراموں کو قبول کریں تو یہ کوئی اکراہ کی بات نہیں ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس پر مجبور ہیں۔ میں آپ سے عرض کروں پاکستان کو استعماری معاشی پروگرام کو قبول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بالکل قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ پاکستان کی معیشت ایک مضبوط معیشت ہے۔

پاکستانی معیشت مستحکم معیشت ہے

پاکستانی معیشت ایک نہایت طاقت ور اور مستحکم معیشت ہے۔ پاکستانی معیشت کو کسی بحران کا سامنا نہیں ہے، یہ بات محض کہنے کی بات نہیں اگر آپ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے اعداد و شمار دیکھیں تو اس میں یہ بات بالکل ثابت ہو جاتی ہے۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کی کیا خصوصیت ہے؟ اس سال کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سال ہمیں بین الاقوامی سطح سے تقریباً کوئی امداد نہیں ملی۔ جب ہم نے جوہری دھماکا کیا تو ۱۹۹۸ء کے بعد سے ہماری بین الاقوامی امداد بند ہو گئی۔ لیکن یہ کہ پائپ لائن میں کچھ پیسے موجود تھے۔ ایسے پیسے جو پہلے سے منظور ہو گئے تھے لیکن اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی، وہ ملتے رہے۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں فی الواقع پورے طور پر وہ تحدیدات جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جوہری دھماکے کے نتیجے میں ہمارے اوپر لگائی گئی تھیں نافذ ہوگئیں اور بالخصوص آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور اسلامک بینک سے تو ہمیں ایک دھیلا بھی نہیں ملا۔ یہ بات بھی اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامک ڈویلپمنٹ بینک بھی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا ہی حلیف ہے جیسے ایشین ڈویلپمنٹ یا افریقین ڈویلپمنٹ بینک ہیں، اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کی حیثیت میں اور بین الاقوامی اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں ہمیں آئی ایم ایف ورلڈ بینک، ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کہیں سے کچھ نہیں ملا۔ نہ صرف یہ کہ کہیں سے کچھ نہیں ملا بل کہ ہم نے تقریباً چھ بلین ڈالر اپنے وسائل سے پرانے سود اور واجبات کے طور پر ان کو ادا کیے۔ فی الواقع ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں ہم نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو امداد دی ہے۔ انھوں نے ہمیں ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں کوئی امداد نہیں دی۔ اس سال ہمارے ہاں آئی ایم ایف کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ کوئی ہمارے اوپر آئی ایم ایف کی نگرانی نہیں تھی۔ اس سال ہماری شرح نمو (Gross Domestic Product) پانچ فی صد، ہماری شرح افراطِ زر صرف تین اعشاریہ چھ فی صد۔ یہ اعداد و شمار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ پاکستان عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی امداد کے بغیر بھی اپنی معیشت کے استحکام کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

پاکستان کے قدرتی وسائل روس سے زیادہ ہیں

پاکستانی معیشت فی الواقع ایک خود کفیل معیشت ہے۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ فی الواقع اگر ہم بین الاقوامی نظام سے اپنا ناتا توڑنا چاہیں تو بالکل ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، کوئی ٹیکنالوجیکل، کوئی فنانشل تحدید نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں ایک تنظیم ہے جسے کہتے ہیں یونیسکو United Nations Educational Scientific and Cultural Organization۔ ۲۰۰۹ء میں اس نے قدرتی وسائل کا ایک سروے کیا۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ قدرتی وسائل کے لحاظ سے ممالک کی کیا حیثیت ہے؟ تو اس مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ پاکستان کے قدرتی وسائل کی استطاعت روس سے زیادہ ہے۔ نہایت طاقت ور اور مستحکم معیشت ہے اور امداد و قرضوں کی صورت سال میں جو پیسہ بھی ملک میں آتا ہے وہ ہماری مجموعی سرمایہ کاری کا دس فی صد بھی نہیں ہوتا۔ نوے سے بانوے فی صد ہر سال سرمایہ کاری ہم اپنے پیسے سے کرتے ہیں۔ ہماری جو مجموعی برآمدات و درآمدات ہیں ہماری مجموعی قومی پیداوار کا بیس سے پچیس فی صد حصہ ہیں۔ کسی معنی میں بھی یہ بات نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان مجبور ہے۔اس بات پر کہ وہ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بنا رہے کوئی مجبوری نہیں ہاں یہ راہ ہم نے خود منتخب کی ہے۔

جمہوری حکومت کا مطلب کیا ہے؟

ہم جمہوری لوگ ہیں۔ ہماری فوجی حکومتیں بھی جمہوری حکومتیں ہوتی ہیں۔ان معنوں میں جمہوری حکومتیں ہوتی ہیں کہ سرمایے کی بڑھوتری یا ترقی اور فلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا ہے۔ہم بالکل خالص جمہوریت پر ایمان لا چکے ہیں چاہے وہ سول حکومت ہو چاہے وہ فوجی حکومت ہو، ہوتی جمہوری حکومت ہی ہے۔ کیوں کہ جمہوری حکومت کا اصل مطلب جمہور کی حکم رانی نہیں بل کہ سرمایہ داری کی حکم رانی ہے اور اس کا اصل آلہ کار بنیادی حقوق ہیں۔ لہٰذا وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہیں بنتی امریکا کے لیے قابل قبول ہیں، خواہ وہ فوجی حکومتیں ہوں۔لیکن کوئی حکومت بھی اگر سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے عقائد و فلسفہ کی راہ میں رکاوٹ ہے تو اس کو تہس نہس کر دیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں ہم نے اہم کام یابی یہ حاصل کی کہ اس سال ہمارا روپیہ بین الاقوامی بازاروں میں بالکل مستحکم رہا۔ ہر سال جب بھی ہم آئی ایم ایف کے ماتحت رہتے ہیں ہمارا روپیہ دس فی صد کے حساب سے اپنی قدر کھو دیتا۔۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں روپیہ ڈی ویلیو نہیں ہوا۔ ایک فی صد بھی ڈی ویلیو نہیں ہوا۔تو فی الواقع اگر ہم خود کفالت کی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں تو بین الاقوامی بازار میں مستحکم ہوتے ہیں، طاقت ور ہوتے ہیں، کم زور نہیں ہوتے لیکن جمہوری نہیں رہتے یہ صحیح بات ہے۔ سرمایے کی عالمی بڑھوتری کی جو خدمت آپ نے اپنی ریاست کے لیے منتخب فرمائی ہے وہ آپ ادا نہیں کر سکتے لہٰذا جمہوریت ہمارے لیے کوئی لازمہ نہیں ہے۔ جمہوریت ہمارے لیے کوئی مجبوری نہیں، کوئی ہمارے اوپر مسلط نہیں کر سکتا اور ہمارے پاس بالکل اختیار موجود ہے کہ ہم کوئی ایسا سیاسی اور معاشرتی نظام اختیار کریں جو خالصتاً اسلامی نظام ہو اور جو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ اداروں کی بالا دستی کو بھی رد کرے اور عالمی سرمایہ کی ماتحتی کو بھی رد کرے، یہ بالکل ممکن ہے۔لیکن چوں کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ہم نے اپنے لیے جو راہ مقرر کی ہے وہ راہ ہے جمہوریت کی بالا دستی کی راہ، وہ راہ ہے سرمایے کی عالمی بالا دستی کو قبول کرنے کی راہ۔ اور اس راہ کو قبول کرنے کے لیے اور اس کو ممکن بنانے کے لیے جو حکمت عملی ہم نے اس وقت اپنائی ہے وہ مقامیت (Localization) ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہم پوسٹ ڈیموکریٹک دور میں زندہ ہیں

مقامیت (Localization) کے عمل کو اچھے طریقے سے سمجھنا اور اسے بالکلیہ رد کرنا ہماری ضرورت ہے۔ مقامی انتخابات میں حصہ لینا اور مقامی اداروں کا حصہ بننا استعمار کی اسی حکمت عملی کو ممکن بنانا ہے جس حکمت عملی کے تحت وہ پاکستان کو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ بنانا چاہتا ہے اور جس کے نتیجے میں سرمایے کے عالمی غلبے کو وہ پاکستان کے لیے قابل قبول بنانا چاہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک کم زوری اس وقت یہ ہے کہ وہ جمہوری عمل کو قومی ریاست سے اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن ایک بہت بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہم جس دور میں ہیں وہ امریکی مفکرین کے مطابق پسِ جمہوری دور (Post Democratic) ہے۔ ہم سرمایہ داری کے پسِ جمہوری (Post Democratic) دور میں زندہ ہیں۔ پسِ جمہوری دور سے کیا مراد ہے؟ یہ مراد کہ عوام کی اکثریت جمہوریت سے مایوس ہوگئی ہے۔ جمہوری عمل میں شرکت سے مایوس ہوگئی ہے اور جمہوری عمل میں شرکت سے لاتعلق ہوگئی ہے۔ امریکا میں تو بغیر شک کے اکثریت کا جمہوریت سے ایمان اٹھ چکا ہے اور امریکی نوجوان تو بالکل ہی جمہوری عمل سے تعلق نہیں رکھتے۔ مغرب میں تو آزادی کی اصلیت واضح ہوگئی ہے کہ آزادی دراصل کیا ہے آزادی سے زیادہ بڑا جبر تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اصلی جبر اگر کوئی ہے تو وہ آزادی ہے۔ یہ بات تو مغرب میں واضح ہوگئی ہے اس وجہ سے ہم پس جمہوری دور میں رہ رہے ہیں۔ چناں چہ کوئی سماجی اجتماعیت بنانا جمہوریت کی بنیاد پر ممکن نہیں رہا۔ جس قسم کی ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کے دوران اجتماعیتیں بنی تھیں جہاں جمہوری عمل کی تصدیق کے لیے ایک نئی شناخت دی گئی تھی کہ تم مزدور ہو، یہ اجتماعیتیں سب منتشر ہوچکیں، لوگ تو تنہا ہوگئے ہیں۔ چناں چہ یہ کہنا کہ ایک بین الاقوامی ریاست قائم کی جائے گی وہ تو ایک ناکام تجربہ ہے۔ جیسا کہ یورپ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تمام ممالک کو ملا کر نئی فیڈریشن بنانے کا منصوبہ بالکل ناکام ہوگیا ہے۔ ان معنوں میں ناکام ہے کہ یورپی انتخابات میں دس فی صد ووٹ بھی نہیں پڑے۔ قومی انتخابات میں تو ان کے ہاں ساٹھ سے ستّر فی صد کے درمیان ووٹ پڑ جاتے ہیں لیکن یورپین انتخابات میں سرے سے ووٹ ہی نہیں ڈالے جاتے۔ چناں چہ قومی سطح سے اوپر اٹھ کر کسی بھی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام سیاسی تنظیم قائم کرنے کا اس وقت اہل نہیں ہے یہ اس کی بنیادی کم زوری ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمہوری عمل کو جاری رکھنا ایک مسئلہ بن گیا ہے

قومی سطح پر جمہوری عمل کو جاری رکھنا سرمایہ دارانہ ریاستوں کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ لوگوں کی کوئی دل چسپی نہیں اس سے اوپر اٹھنے کا کیا سوال؟ لہٰذا کس طریقے سے سرمایہ دارانہ عمل کی قبولیت کو قائم رکھا جائے؟ یہ اس وقت سرمایہ دارانہ سیاسی مفکرین کے لیے نہایت اہم سوال ہے۔ غریب ممالک کے لیے انھوں نے جو اس کا حل تلاش کیا ہے وہ ہے مقامیت۔ مقامیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ بڑے ممالک کو توڑ کر چھوٹے ممالک بنائے جائیں مقامیت کا مطلب یہ ہے کہ قومی ریاست اور قومی ریاست کے عمل سے عام آدمی کی دل چسپی ختم کر دی جائے اور مقامی سطح پر عام آدمی کو اپنی اغراض کا بندہ بنا دیا جائے۔ مقامی حکومتیں (Local Governments) بین الاقوامی سرمایے کی ایجنٹ حکومتیں ہوں گی۔ وہ ان معنوں میں حکومتیں نہیں ہوں گی جیسا کہ صاحبِ اقتدار حکومتیں ہوتی ہیں یا جن معنوں میں اسلام آباد میں ہماری وفاقی حکومت صاحبِ اقتدار حکومت ہے، مقامی حکومتوں کا بنیادی وظیفہ اپنے علاقے میں سرمایے کی بڑھوتری کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور جہاں یہ تجربے کیے گئے ہیں مثلاً انڈونیشیا، جکارتہ اور جنوبی ہندستان میں وہاں جو عملی شکل سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ مقامی حکومتوں نے ایک دوسرے سے اس چیز کے لیے مقابلہ اور مسابقت کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایے کو اپنے علاقے میں کیسے راغب کیا جائے۔ چناں چہ انھوں نے پوری توجہ اس چیز پر دی ہے کہ اپنے علاقے کو بین الاقوامی یا عالمی سرمایے کے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنائیں۔ اس کے لیے انھوں نے جو دو طریقے اختیار کیے ہیں ان میں ایک ہے بین الاقوامی بانڈ جاری کرنا (Floatation of International Bonds)۔ انھوں نے قومی اور بین الاقوامی بازاروں میں اپنے بانڈ جاری کیے ہیں، بانڈ بیچے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص بانڈ خریدے گا تو اس لیے خریدے گا کہ اس سے اسے Dividend ملے، سود ملے، اس کو مستقل آمدنی ہو۔ چناں چہ ان حکومتوں نے اگر وہ پالیسیاں نہیں اختیار کیں کہ جس کے نتیجے میں منافع میں اضافہ ہو رہا ہو، اس طریقے سے کہ وہ منافع بانڈ خریدنے والے کو بھی مل رہا ہو تو وہ بانڈ بیچ دے گا، ان بانڈز کی کوئی قیمت نہیں رہے گی۔ لہٰذا جس وقت مقامی حکومت کی حکمتِ عملی اس بات پر منحصر ہو جائے کہ اس کے میزانیہ (بجٹ) کا ایک بڑا ذریعہ بانڈز بن جائیں تو وہ مجبور ہے کہ اس نوعیت کی پالیسی اختیار کرے کہ جس کے نتیجے میں عالمی سرمایہ کی مقدار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔ منافع کی شرح میں اضافہ ممکن ہو سکے۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

دوسرا طریقہ نج کاری ہے۔ نج کاری سے مراد یہ کہ اپنے وسائل کو بین الاقوامی کمپنیوں کو، عالمی سرمایے کے سپرد کر دو۔ مثلاً جکارتہ میں پانی کا پورا نظام ایک امریکی کمپنی کے سپرد کر دیا گیا اور بنگلور اور مدراس میں ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مقامی حکومت قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو صرف اور صرف اغراض کے گرد، مسائل کی سیاست کے گرد، ایشوز کے گرد مرتکز کیا جائے اور اغراض کے حصول کے اردگرد عوام کو متحد کیا جائے اور کہا جائے کہ لوکل گورنمنٹ ایجنسیز ہیں یہ ایک اچھی حکم رانی کا ذریعہ ہیں۔ اچھی حکم رانی سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس نوعیت کی حکومت قائم کرنا کہ جس کے نتیجے میں سرمایے کے اضافے اور سرمایے کی ترسیل میں اس علاقے کا حصہ زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ جو مقامی حکومت ہوتی ہے وہ خودمختار ہوتی ہے ہاں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی حکومت کم زور ہو جاتی ہے۔ قومی حکومت کم زور کیوں ہو جاتی ہے؟ قومی حکومت اس لیے کم زور ہو جاتی ہے کہ مقامی حکومتوں کے قیام میں سیاست عالیہ (High Politics) ناجائز ہو جاتی ہے۔ سیاست عالیہ کیا ہے؟ ہائی پالیٹکس وہ پالیٹکس ہے جو ایک ریاست کی شناخت متعین کرتی ہے۔ اب موجودہ دور میں ایک ریاست کی شناخت متعین کرنے کے لیے دو حکمت عملیاں، دو پالیسیاں نہایت اہم ہیں۔ ایک خارجہ پالیسی اور دوسری معاشی پالیسی۔ اگر آپ ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو اسلامی ریاست بنانے کے لیے آپ کو ایک خاص نوعیت کی معاشی پالیسی اختیار کرنا پڑے گی اور ایک خاص نوعیت کی خارجہ پالیسی اختیار کرنا پڑے گی۔ جہاں بھی اور جب بھی بیسویں صدی میں اسلامی ریاست قائم ہوئی چاہے وہ سوڈان ہو چاہے وہ ایران ہو چاہے افغانستان ہو عوام کی قربانی دینے کی صلاحیت کا امتحان لیا گیا۔ اسلامی ریاست کے قیام کے نتیجے میں لوگوں کا معیار زندگی بلند نہیں ہوا؛ لوگوں کو فاقے کا سامنا کرنا پڑا، لوگوں کو جانوں کے نذرانے دینا پڑے، لوگوں کو اپنے معاشروں کو اتھل پتھل ہوتا ہوا دیکھنا پڑا، لوگوں کو استعمار کا ظلم اور جبر برداشت کرنا پڑا۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے لازم ہے کہ لوگ اپنی اغراض کو پسِ پشت ڈال دیں۔ ضرورت ہے کہ لوگ قربانی اور ایثار کے لیے تیار ہوں اور وہ غلبۂ دین کی جدوجہد معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے نہ کریں بل کہ جدوجہد غلبۂ اسلامی حصولِ رضائے الٰہی اور شہادت کے شوق کے لیے کریں۔ مقامیت یعنی لوکلائزیشن تو انسان کو غرض کا بندہ ہی بناتی ہے اور وہ شخص جو کراچی میں بین الاقوامی سرمایے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتا ہے غلبۂ دین کے لیے کیا کام کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کیا قربانی دے گا؟ وہ تو پانی کے اور گٹروں کے انتظام اور بسوں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آمد و رفت کو زندگی کا مقصد بنائے گا۔ اچھی حکومت کو زندگی کا حاصل سمجھے گا۔

چناں چہ مقامیت (لوکلائزیشن) کے عمل کے تحت اقتدار نیچے منتقل نہیں ہوتا، اقتدار اوپر جاتا ہے۔ اگر ہم وہ حکمت عملی اپنائیں، وہ خارجہ پالیسی اپنائیں جو مغرب کو پسند ہو یا میکرو اکنامک پالیسی وہ اختیار کریں جس پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک تصدیق کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں فی الواقع ہم عالمی سرمایہ دارانہ ریاست کے باج گزار کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ یہ پاکستان کو کم زور کرنے کی حکمتِ عملی ہے توڑنے کی حکمتِ عملی نہیں ہے۔ اقتدار اعلا کو اوپر کی طرف منتقل کرنے کی حکمت عملی ہے اور عوام کو ہائی پالیٹکس سے جس کے نتیجے میں پاکستانی ریاست کا تشخص متعین ہوتا ہے، اس سیاست سے ہاتھ کھینچ لینے کی طرف تیار کرنے کی حکمت عملی ہے۔ پاکستان کے عوام اس چیز کی طرف توجہ دیں کہ ان کو حقوق کتنے مل رہے ہیں وہ اپنے اوپر ظلم ختم کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس طرف متوجہ نہ ہوں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کائنات کی اور آخرت کی حقیقت کیا ہے؟ امت مسلمہ کا مقصد وجود کیا ہے؟ بین الاقوامی سطح پر استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں کس نوعیت کی معاشی حکمت عملی کی ضرورت ہے؟ یہ تمام باتیں کہنے سننے کی باتیں ہیں ہمیں ان کو بھول جانا چاہیے اور ہماری ریاست اس قابل ہی نہیں رہنی چاہیے کہ وہ اس نوعیت کے معاملات پر کوئی بھی موثر قدم اٹھا سکے۔ بل کہ ہماری ریاست کو استعمار کی ایک باج گزار ریاست ہونا چاہیے ایک ایسی ریاست ہونا چاہیے جس کا مقصد وجود یہ ہو کہ مقامی حکومتوں کو اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ عالمی سرمایے کو اپنے دائرۂ کار میں کھینچ سکیں اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کر سکیں کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو اور ہم ایک فلاحی ریاست قائم کر لیں۔ یورپ میں ویل فیئر اسٹیٹس مفادات، ذاتی اغراض کی بنیاد پر قائم ہوئیں، اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے سول سوسائٹی کا تجربہ کیا گیا لیکن سول سوسائٹی خاندان اور معاشرے کا نعم البدل نہ بن سکی کیوں کہ اس کی بنیادی محبت، قربانی، ایثار اور بے لوث تعلق پر تھی جب کہ سول سوسائٹی کی بنیاد صرف غرض، معاہدے اور خواہشِ نفس پر رکھی گئی ہے۔ جس کے اندر لوگ صلہ رحمی کی بنیاد پر تعلقات قائم نہ کرتے ہوں بل کہ ان تعلقات سے ماورا ہو کر غرض کی بنیاد پر متحد ہو جائیں اور ان کی سیاسی زندگی کا مقصد اپنے حقوق کا حصول ہو اور ان کا نعرہ یہ ''ہمارے حق ہیں ہمیں دو''۔ ان حقوق کی بنیاد پر آپ ان کو متحد کریں گے تو وہ سرمایے کے بندے بن جائیں گے۔ غرض کی بنیاد پر متحد ہونے والے کبھی غرض کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتے۔ اس کے نتیجے میں حاسد، حریص خود غرض معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس کے ہر فرد کا دوسرے فرد سے تعلق محض کسی فائدے اور غرض کے لیے ہوتا ہے۔ حقوق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی طلب اور سرمایہ داری کی بالا دستی کو قبول کرنا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں حقوق کی سیاست سرمایہ داری کی بالا دستی کی سیاست ہے اور کوئی سیاست نہیں، اس کو آپ کوئی نام بھی دے لیں۔ جمہوری عمل، مقامیت، سرمایہ داری کے فروغ کے نتیجے میں حقوق، حرص اور حسد کی روش فروغ پاتی ہے اور معاشرہ خواہشات کی اندھی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مذہبی سیاسی جماعتیں عوامی مقبولیت کیوں حاصل نہیں کر پا رہیں؟

تین مذہبی سیاسی جماعتیں، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور جماعتِ اسلامی پچھلی چھ دہائیوں سے عوامی مقبولیت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی جماعت بھی ایک مضبوط عوامی جماعت بننے میں کام یاب نہیں ہو سکی۔

اس کے برعکس سیکولر سیاسی جماعتیں پی پی پی، مسلم لیگ، تحریک انصاف اور ایم کیو ایم عوامی جماعتیں بننے میں کام یاب ہو گئیں۔ اس تضاد کی کیا وجہ ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے کیوں کہ عوامی جماعت بنے بغیر عوامی تحریک معاشرتی سطح پر برپا نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم اس ملک میں غلبہ دین چاہتے ہیں (اور اسی چیز کو اسلامی انقلاب کہتے ہیں) تو اسلامی سیاسی جماعتوں کو عوامی جماعتیں لازماً بننا ہوگا تا کہ وہ عوامی تحریک پیدا اور منظم کر سکیں۔

ہماری تینوں اسلامی سیاسی جماعتیں نظریاتی جماعتیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ عوامی جماعتیں نہ بن سکیں۔ جماعتِ اسلامی تو اپنے نظریاتی تشخص پر فخر کرتی ہے۔ اس نے اپنے انتخابی منشور میں نظریاتی تشخص پر صراحتاً اصرار کیا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان بھی مخصوص نظریاتی مسالک (دیوبندیت اور بریلویت) سے وابستہ اور میری رائے میں یہ دونوں بھی بنیادی طور پر نظریاتی سیاسی جماعتیں ہیں۔

اسلامی نظریاتی جماعتیں اسلامی عوامی جماعتیں نہیں بن سکتیں۔ اس بات کو آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل امام غزالی رحمہ اللہ نے دو اور دو چار کی طرح واضح کیا اور امام ابن خلدون رحمہ اللہ کے مقدمہ میں بھی اسی نوعیت کے دلائل جا بہ جا ملتے ہیں۔ چوں کہ ہماری سیاسی جدوجہد اسلامی سیاسی مفکرین سے ماخوذ نہیں اور ہمارے مدارس تک میں ائمہ سیاسیات (امام ماوردی، امام ابو یعلیٰ، امام محمد، امام ابن خلدون وغیرہ) کی تالیفات کو نظر انداز کیا جاتا ہے، لہٰذا ہم امام غزالی اور امام ابن خلدون رحمہم اللہ کے تفکرات سے واقعتاً ناواقف ہیں اور انھیں قابلِ توجہ نہیں سمجھتے۔

جماعت اسلامی اپنے ۲۰۱۳ء کے انتخابی منشور میں اپنے ماڈرن ہونے کا بھی اقرار کرتی ہے (صفحہ ۲)۔ جماعت اسلامی ان معنوں میں ایک ماڈرن جماعت ہے کہ مولانا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مودودی کے سیاسی نظریات جیفرسن اور مونٹیسکو اور لاک سے ماخوذ ہیں، امام ماوردی، امام غزالی اور امام ابن خلدون رحمہم اللہ کے سیاسی افکار سے ماخوذ نہیں۔

جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کی سیاسی جدوجہد بھی انھی معنوں میں ماڈرن ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی اسلام کاری پر مرتکز ہے اور اس کا دُور کا بھی واسطہ ائمہ سیاسیات کے تصورات سے نہیں۔

ان حالات میں ہم اسلامی عوامی تحرک (جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے انیسویں صدی میں پیدا کیا تھا) کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں اسلامی عوامی تحرک پیدا کرنا ہے تو ہمیں لامحالہ اس سیاسی فکر سے استفادہ کرنا ہوگا جو ایک ہزار سال تک اسلامی ریاستی غلبہ کی اساس ثابت ہوئی ہے۔

اس مضمون میں مَیں پہلے امام غزالی رحمہ اللہ کی اس دلیل کو دہراؤں گا جو امام صاحب نے اپنی کتاب ''فیصل التفرقہ بین الاسلام والزنادقہ'' میں نظریاتی جدوجہد کے محدود ہونے کے ضمن میں واضح فرمائی ہے۔ اس کے بعد مَیں ان وجوہات کی نشان دہی کروں گا جن کے سبب ہم نظریاتی جدوجہد کو عوامی اسلامی تحرک کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں۔ آخر میں مَیں اسلامی عوامی تحرک منظم کرنے کے ضمن میں چند تجاویز پیش کروں گا۔

امام غزالی رحمہ اللہ کی دلیل

امام غزالی رحمہ اللہ ''فیصل التفرقہ'' میں عقائد اور نظریات میں واضح فرق کرتے ہیں۔ امام صاحب کے مطابق اسلام کے بنیادی عَقائد تین ہیں: توحید، رسالت اور آخرت! ان عقائد کی تشریح کے ضمن میں جو نظامِ فکر مرتب کیے جاتے ہیں وہ لامحالہ تاویلِ نصوص کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں اور منطق ان تشریحات کی معقولیت کے مطمئن کرنے کا ذریعہ ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ تاویل کی ان تشریحات کو ''نظریات'' اور حنبلیت اور اشعریت کو بھی نظریات گردانتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ان نظریات میں فرق عقائد کا نہیں بل کہ تنظیمِ تاویلات کا ہے، اس کے باوجود کہ دونوں مکاتیب ایک ہی اصول التاویل کی بنیاد پر اپنا نظام فکر مرتب کرتے ہیں۔

جب حنبلی عالم، اشعری عالم سے مکالمہ کرتا ہے تو لازماً معقولیات اس ایک دائرے میں رہتی ہے کیوں کہ عقائد دونوں کے ایک ہی ہیں اور گفتگو اسی پر ہے کہ کون سا نظام تاویل یعنی نظریہ زیادہ معقول ہے؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام فرماتے ہیں کہ عقلی بنیادوں پر دیے گئے دلائل ذاتی میلانات اور خواہشات کو متاثر نہیں کرتے۔ عقلی دلائل روح سے مخاطب نہیں ہوتے۔ انفرادی رویے عقلی دلائل سے تبدیل نہیں ہوتے۔ مناظرات کے نتیجے میں لوگ لاجواب تو ہو جاتے ہیں ان کے دِل نہیں بدلتے۔ افعال اور خواہشات میں تبدیلی کا طریقہ مناظرہ نہیں مراقبہ ہے اور کیفیات قلوب کی تبدیلی سے حاصل ہوتی ہیں۔

عقل طے شدہ مقاصدِ حیات کے حصول کا ذریعہ ہے وہ مقاصد کا تعین کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مقاصدِ حیات اور طرزِ زندگی میں تبدیلی روحانی معرفت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے عقلی استعداد میں اضافے سے حاصل نہیں ہوتی، اس بات کو علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا ہے۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

امام فرماتے ہیں کہ ذاتی زندگی میں للّٰہیت کے شعور کا فروغ تعلیمات اسلامی کا بنیادی وظیفہ ہے۔ ارادوں کی تبدیلی اسلام کا بنیادی مقصود ہے۔ اسلام لوگوں کی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ نفس کی ایسی تطہیر کا خواہش مند ہے جو حصولِ رضائے الٰہی کو انفرادی زندگی کا واحد مقصد بنا دے۔ عقلی دلائل کتنے متاثر کن کیوں نہ ہوں خواہشات نفسیانیہ کی تسخیر کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ عقلی اور کلامی مباحث تقویت ایمان اور تبدیلی قلوب کا ذریعہ کبھی نہیں بن سکتے۔

لیکن امام غزالی علم کلام کی ضرورت اور افادیت کی تصدیق فرماتے ہیں۔ معقولیات ہی کی بنیاد پر ہم کفریہ مفروضات اور تعلیمات کی منطقی تنقید کر کے ان کو مہمل، غیر منطقی اور مضر ثابت کرتے ہیں اور کفریہ نظریات کے غیر معقول ہونے کی مستحکم دلیل فراہم کرتے ہیں۔ عقل ایک ایسا ہتھیار ہے جو عقائدِ اسلامی کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ مثلاً امام ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی تصورِ معاد اور آخرت کی تردید میں معتزلہ اور دیگر فیلسوف کوئی منطقی مفروضہ مرتب نہ کر سکے اور ان کے اپنے عقائد غیر منطقی مفروضات سے بھرے پڑے ہیں لہٰذا لغو اور نامعقول ہیں۔

معقولیات اور کلامی مباحث کو سماجی اور سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیے جانا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ناگزیر ہے لیکن ان مباحث سے کسی کو مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ عموماً علمائے کلام مُزکّی نہیں ہوتے۔ امام کی رائے میں ایمانِ راسخ، طرائق اور رسوم کے فروغ کے نتیجے میں اور روحانی کیفیات اور تجربات تک رسائی کے نتیجے میں فروغ پاتا ہے۔ کلامی مباحث میں شرکت اس کا ذریعہ کبھی نہیں بن سکتے۔ اس کے علاوہ کلامی مباحث کا ایک بہت خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ تاویلِ نصوص میں افتراق کے نتیجے میں علمائے کلام دوسرے نظام ہائے تاویل سے متعلق علما اور افراد کو گم راہ اور دائرہ اسلام سے خارج تصور کرنے لگتے ہیں۔ کلامی مباحث فرقہ واریت کو فروغ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، گو کہ یہ "صلاحیت" علم کلام تک محدود نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام غزالی کی تعلیمات کے مطابق:

۱۔ کلامی مباحث مفتاح القلوب اور تبدیلی خواہشات کا ذریعہ نہیں بن سکتے اور ان سے اس نوعیت کی تبدیلی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

۲۔ کلامی مباحث عقائد اسلامی کی حقانیت اور کفریہ عقائد اور مفروضات کے ابطال اور غیر معقول ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

۳۔ کلامی مباحث راسخ العقیدہ متکلمین تک محدود رہنے چاہییں۔ عوام کو ان مباحث کی بنیاد پر دعوتِ دین نہیں دینی چاہیے، کیوں کہ ہماری تاریخ میں اس عمل سے لامحالہ فرقہ واریت فروغ پائی ہے۔

کلامی مباحث سے عوامی تحرک کی امید کی وجوہات

میں اس حصے میں گفتگو صرف برصغیر کے تجربات تک محدود رکھوں گا۔

برصغیر میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (اٹھارویں صدی عیسوی) اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (اٹھارویں صدی عیسوی) کے علاوہ صف اول کے سیاسی متکلمین عنقا ہیں۔ تحفظِ دین اور فروغ اسلام کا کام صوفیائے چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ وغیرہ نے کیا اور غلبۂ دین کی ذمہ داری پٹھان اور مغلیہ سلاطین نے سنبھالی اور ایک مستحکم اسلامی ریاست جس میں شرع نافذ تھی اور تمام اجتماعی فیصلے علوم اسلامی کی بنیاد پر کیے جاتے تھے، چھ سو سال تک قائم رہی۔ سلطنت عثمانیہ کے برعکس پٹھان اور مغل سلطنتوں کے عمال بننے سے صوفیائے برصغیر نے اس سے احتراز فرمایا کیوں کہ وہ تبلیغ اسلام کے کام کو فوقیت دیتے تھے اور ان کی رائے میں سلاطین غلبہ دین کے فریضہ کو بہ خوبی انجام دے رہے تھے۔ لہٰذا برصغیر کی اسلامی علمی روایات میں سیاسی مباحث تقریباً ناپید ہوگئے۔ کم از کم اٹھارویں صدی کے بعد یہ رائے غلط ثابت ہوئی۔

انگریز کے سیاسی تسلط کے دور (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء) میں اجتماعی سیاسی مسائل سے سہوِ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نظر کرنا ناممکن ہوگیا اور مسلم مفکرین نے ان امور کی طرف توجہ دینا شروع کی لیکن ان مفکرین کی صفوں میں عموماً علما شامل نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد میں اور اس کے تقریباً ساٹھ سال بعد تک سیاسی شعور رکھنے والے علما (اکابرین دیوبند، علمائے صادق پور اور حاجی شریعت اللہ کے تلامذہ) انگریز کا بذریعہ جہاد اخراج اور مغل سلطنت کے احیا کو ممکن سمجھتے تھے۔ یہی شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ کی توقع اور تعلیم تھی۔ لہٰذا کسی نئے سیاسی کلامی مباحث کے فروغ کی ضرورت کے قائل نہ تھے، چناں چہ قبلہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی، حضرت نانوتوی، مولانا ولایت علی، امام گنگوہی وغیرہ نے ایک نئے سیاسی علم کلام جس کا مقصد غلبۂ دین کو برصغیر میں دوبارہ ممکن بنانا ہو، کی ترویج کی طرف توجہ نہ فرمائی۔

۱۹۲۰ء میں جمعیت علمائے ہند اور سنی کانفرنس کے قیام کے بعد علمائے دیوبند اور بریلی نے انگریز حکومت کے سلسلہ میں پرامن بقائے باہمی کا رویہ اختیار کیا۔ عملاً یہ غلبہ اسلام کی جدوجہد سے برأت کا اعلان تھا اور جمہور علما کی توجہ ایک غیر اسلامی ریاست میں اسلامی شخصیت اور معاشرت کے تحفظ پر مرکوز ہوگئی۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر آج تک علمائے دیوبند اور بریلی کی نمایندہ جماعتیں یہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

جہاد ۱۸۵۷ء کے بعد غیر علما مسلم مفکرین نے ایک سیاسی علم کلام مرتب کیا۔ سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، چراغ علی اور علامہ اقبال اس نئے علم کلام کے سرخیل تھے۔ یہ ایک سیکولر علم کلام تھا، ان معنوں میں کہ اس نے اسلامی عقائد کی ایسی تاویلات پیش کیں جو اسلامی انفرادیت، معاشرت اور نظام اقتدار کو یورپی انفرادیت، معاشرت اور اقتدار میں ضم کرنے کا جواز فراہم کرتا تھا۔ علمائے دیوبند اور بریلی نے اس سیکولر علم کلام کی تکذیب نہ کی بل کہ اس میں ترمیم اور اس کی اصلاح پر زور دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علما انگریزی نظام اقتدار سے سمجھوتا کر چکے تھے۔ سیکولر جماعتوں، مسلم لیگ اور کانگریس کے حلیف تھے اور برصغیر میں غلبہ دین کو ناممکن تصور کرتے تھے۔

www.kitabosunnat.com

اسلامی علم کلام کی احیا کی بیسویں صدی کے ہندستان میں کوشش کرنے والے پہلے راسخ العقیدہ عالم دین مولانا مودودی تھے۔ آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کے تصورِ نظام کو اپنے مباحث کا کلیدی تصور بنایا اور مغربی تہذیب کو "جاہلیتِ خالصہ" برملا قرار دیا۔ اسلامی عقائد کی ٹھیٹ اسلامی مذہبی توجیہات پیش کیں اور غلبہ دین کو موجودہ حالات میں نہ صرف ممکن بل کہ ناگزیر بتایا، لیکن مولانا مودودی کا سیاسی علم کلام مسلمانوں کے تاریخی سیاسی علم کلام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا ہے۔ مولانا مودودی کی سیاسی فکر خالصتاً معروضی اور غیر تاریخی ہے۔ جب وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سوال اٹھاتے ہیں اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟ تو یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ شیر شاہ سوری، ناصر الدین محمد اور امام عالمگیر نے ہندستان میں اسلامی حکومت کیسے قائم کی۔ چوں کہ مولانا مودودی کی سیاسی فکر معروضی ہے لہٰذا وہ دورِ حاضر کی عقلیت کی بنیاد پر ہی اپنے سیاسی تصورات کی تشریح کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے مذہبی علم کلام کے بارے میں درست نہیں۔ ان کی تفسیر قرآن قدیم علمائے تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ ہی سے ماخوذ ہے اور وہ اسلامی مابعد الطبیعیاتی عقائد کی ماڈرنسٹ تشبیہات کی نہایت شدت سے تردید کرتے ہیں۔

چوں کہ بیسویں صدی کی غالب سیاسی علمیت لبرل ازم ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی کی معروضیت ان کو لاک اور جیفرسن کا پیروکار بنا دیتی ہے، امام غزالی، امام ابن خلدون اور امام ماوردی کا نہیں۔ لہٰذا عملاً مولانا مودودی علمائے دیوبند اور بریلی کی طرح سرمایہ دارانہ جمہوریت کی اسلام کاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تسخیر کا کوئی تصور علمائے دیوبند، بریلی اور مولانا مودودی کے پاس موجود نہیں۔ اصولاً یہ تمام علما لبرل ازم اور قوم پرستی کی اسلام کاری کرتے ہیں۔

لبرل ازم جس معاشرت اور انفرادیت کی بنیاد پر اپنا نظام اقتدار قائم کرتی ہے وہ یورپ میں سرمایہ دارانہ ریاستوں کے قیام سے تین سو سال پہلے غالب آ چکی تھی۔ لہٰذا لبرل علم کلام کی سیاسی آدرشوں کو انفرادی اور معاشرتی سطح پر مقبولیت عام دلانے کی کوئی ضرورت کسی یورپی لبرل ریاست کو کبھی پیش نہ آئی اور چوں کہ قوم پرستی اور سوشل ازم سرمایہ دارانہ نظریہ اقتدار ہیں لہٰذا ان کا تصورِ انفرادیت اور معاشرت لبرل تصورِ انفرادیت و معاشرت سے اصولی طور پر مختلف نہیں۔

یورپ اور اس کی نو آبادیوں امریکا، آسٹریلیا وغیرہ میں سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو فروغ دینے والی اور استحکام فراہم کرنے والی قوتیں معاشرتی بھی تھیں اور ریاستی بھی۔ سب سے بنیادی تبدیلی جو یورپ میں رونما ہوئی وہ عیسائی اقدار کا ترک اور حرص اور حسد کا عمومی فروغ تھا۔ حرص اور حسد کے فروغ کی دو وجوہات تھیں۔ ایک عیسائی فکر کا نیو افلاطونیت اور ارسطو کی فکر اور آدرشوں کی عیسائی کاری اس علمی رویہ کو Scholastician کہتے ہیں اور اس کی ابتدا بارھویں صدی عیسوی سے ہوگئی تھی اور اس کا سب سے اہم مفکر ایکویناس ہے۔ اس علمی تحریک نے عیسائی تعلیمات کو مسخ کر دیا اور قدیم یونانی اقدار کو عیسائی جواز فراہم کیے۔ Scholastician کے فروغ کے نتیجے میں یورپ میں پندرھویں صدی میں تحریکات نشاۃ ثانیہ برپا ہوئیں اور تسخیر کائنات کے ہدف کو عمومی معاشرتی مقبولیت حاصل ہوئی چودھویں سے اٹھارویں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صدی تک سائنس، فن اور مذہب میں جو معاشرتی جنگ جاری رہی اس میں ہر محاذ پر عیسائیت مستقل پسپا ہوتی رہی اور ہر سطح پر عیسائی علمیت غیر معقول اور غیر معتبر ثابت ہوتی گئی۔ حرص اور حسد کو فروغ دینے کی فکر کو فیصلہ کن فتح اٹھارویں صدی کی تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کے ذریعے حاصل ہوئی۔

حرص اور حسد کے یورپ میں عمومی غلبے کی دوسری وجہ یورپی استعمار کی مہمات ہیں۔ یہ مہمات پندرھویں صدی سے شروع ہو کر آج تک جاری ہیں۔ پچھلے چھ سو سال سے یورپی اقوام نہایت منظم طور پر پوری دنیا میں قتل و غارت اور لوٹ مار کر رہی ہیں۔ وہ کروڑوں آدمیوں کو قتل کر چکی ہیں۔ امریکا میں آٹھ کروڑ ریڈ انڈینوں کے قتل عام سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور بیسویں اور اکیسویں صدی میں کئی ملین عراقی اور افغانی مسلمانوں کا قتل عام اب تک جاری ہے۔ یورپی اقوام نے پورے کے پورے براعظم لوٹ لیے اور مستقل لوٹے جا رہی ہیں۔ اس لوٹ مار سے یورپ اور امریکا کے ہر گھرانے کا ہر فرد مستفید ہو رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ سفاکیت اور بہیمیت نے ہر امریکی کو بہ قول امام خمینی ''شیطان بزرگ'' بنا دیا ہے۔

حرص اور ہوس کی انفرادیت اور معاشرت پر غلبے کو منظم اور مستحکم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار پر مبنی سرمایہ دارانہ ریاست وجود میں آئی۔ اس ریاستی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ایک پیشہ وارانہ فوج اور ایک پیشہ وارانہ نوکر شاہی اور ایک پیشہ وارانہ عدلیہ ہے۔ یہ تینوں کلیدی ادارے مستقل نوعیت کے ہیں۔ ان میں شمولیت سرمایہ دارانہ علمیت اور مہارت کی استعداد کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ ان تینوں کلیدی اداروں کا مقصد وجود سرمایہ کی بڑھوتری میں مستقل اضافہ ہے۔ ان تینوں اداروں کی کارکردگی اسی بنیاد پر جانچی جاتی ہے کہ یہ حرص اور حسد اور خواہشاتِ نفسانی کے حصول کو کتنا فروغ دے رہے ہیں؟

ان ریاستی اداروں کو فوقیت دینے والے معاشرتی ادارے بھی قائم ہیں۔ ان میں سب سے اہم، سرمایہ دارانہ تعلیم کے ادارے (اسکول اور یونی ورسٹیاں) صنعت، تفریح اور کارپوریشن ہیں۔ تعلیم اور تفریح کو فروغ دے کر حرص اور حسد کو زندگی کے واحد مقصد کے طور پر معاشرتی تفوق اور غلبہ فراہم کیا جاتا ہے۔ آج میڈیا تعلیم اور تفریح کے ادارتی نظاموں کو یک جا کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے اور تفریح اور تعلیم کو ضم کرنے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی وجود میں لائی گئی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اقتدار یعنی ریاست کی نگراں کمیٹی کو حکومت کہتے ہیں۔ لبرل سرمایہ دارانہ ریاستوں میں یہ نگراں کمیٹی تبدیل ہوتی رہتی ہے (بذریعہ انتخابات)۔ اس نگراں

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

کمیٹی کا بنیادی فرض سرمایے کی بڑھوتری کی اس حکمت عملی کو فروغ دینا ہوتا ہے جس حکمت عملی کو عوامی حمایت حاصل ہو اور اس عمل کے ذریعے میڈیا کے ساتھ ساتھ حکومت بھی حرص اور حسد کے عوامی اعتقادات کو فروغ دینے کا فرض سرانجام دیتی ہے۔

اس حکومتی ڈھانچے کے حدود اربعہ کا تعین سرمایہ دارانہ دستور کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ کارپوریشن، سرمایہ دارانہ بیوروکریسی سرمایہ دارانہ عدلیہ اور سرمایہ دارانہ افواج کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ دستور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ حکومت صرف اس بات کی ذمہ دار ہے کہ یہ تمام ادارے سرمایہ میں بڑھوتری کی اس حکمتِ عملی کو فروغ دیں جس کو عوام کی تائید میڈیا اور سیاسی جماعتوں نے دلوائی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں انقلابی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں۔ ان سرمایہ دارانہ انقلابات کے ذریعے لبرل حکومتوں کی جگہ قوم پرست یا اشتراکی سرمایہ دارانہ حکومتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۸۹ء کے بعد کئی اشتراکی اور قوم پرست حکومتوں کا تختہ الٹ کر لبرل حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ عمل ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۶ء تک مشرقی یورپ میں اور ''عرب بہار'' کی صورت میں ۲۰۱۱ء میں بروئے کار آیا۔ ان سرمایہ دارانہ انقلابات کے ذریعے سرمایہ دارانہ معاشرت اور انفرادیت متاثر نہیں ہوتیں۔ کارپوریشن، اسکول، عدلیہ، فوج، نوکر شاہی، سرمایے کی بڑھوتری کو فروغ دیتی رہتی ہیں۔ تبدیلی صرف یہ ہوتی ہے کہ لبرل معاشرتی ادارہ سرمایے کی بڑھوتری کو انفرادی نفسانی خواہشات کا ذریعہ بناتی ہیں۔ قوم پرست حکومتیں سرمایے کی بڑھوتری کو قومی مفاد (یعنی اجتماعی نفسانی خواہشات) کے حصول کا ذریعہ بناتی ہیں۔ اشتراکی حکومتیں سرمایے کی بڑھوتری کو طبقاتی مفاد کا ذریعہ بناتی ہیں، اس کو پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اقتدار اور سرمایہ دارانہ معاشرتی صف بندی ہم پر انگریز استعمار نے مسلط کی، انگریز نے ہماری فوج، پولیس، کارپوریشن، بینک، اسکول، یونی ورسٹیاں، تفریحی ادارے، عدلیہ، میڈیا، مقننہ اور دستور وضع کیا۔ معاشرتی سطح پر تو چند اسلامی روایتی ادارے انگریزی دست برد سے محفوظ رہے۔ مثلاً خاندان، برادریاں، قبائل، جرگہ، مدارس، خانقاہیں، مزارات، مساجد، پنچایتیں، غیر سرمایہ دارانہ تنظیم ملکیت وغیرہ۔ لیکن اسلامی نظام اقتدار تقریباً مطلقاً تحلیل ہوگیا۔ اسلامی نظام اقتدار کے احیا کا تصور تک ہمارے ذہنوں سے بالکل محو ہو گیا۔ ہماری تحریکِ استخلاص وطن اور تحریک پاکستان تو خالص سرمایہ دار قوم پرست تحریکات تھیں۔ اسلامی تحریکات کے لیے ہندو کو مسلمان بنانا کسی کا سیاسی ہدف نہ رہا حال آں کہ جہاد ۱۸۵۷ء میں مولانا خیرآبادی اور مولانا مدارسی کے دستِ حق پرست پر سیکڑوں مرہٹے مشرف بہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلام ہوئے تھے اور سب سے بڑا مرہٹہ کمانڈر ٹانٹیاں ٹوپی مسلمان ہو کر شہید ہوا۔

جمہور علمائے دیو بند اور بریلی مسلم لیگ اور کانگریس کے ہم نوا بن گئے۔ سب نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا، حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری کو بالکل اکیلا چھوڑ دیا اور تحریک احرار پر ''پنجابی ٹولہ'' ہونے کا بہتان لگایا۔

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اس دور کے سب سے اہم متکلم اسلام مولانا مودودی نے مغرب کو جاہلیت خالصہ قرار دیا تھا لیکن اپنی ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ء کی تصنیفات (بالخصوص تنقیحات اور اسلامی دستور) میں لبرل سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو اسلامی جواز فراہم کیا۔ ان تحریروں میں اور بعد میں تفصیل کے ساتھ خلافت اور ملوکیت میں سرمایہ دارانہ لبرل ریاستی تنظیم کی اسلام کاری کی اور ملوکیت کو ایک غیر اسلامی طرز حکومت قرار دے کر پوری اسلامی سیاسی تاریخ کو غیر معتبر گردانا۔

چوں کہ مولانا مودودی ایک متکلم تھے مزکی نہ تھے لہٰذا آپ کی تحریرات عقل اور دانش کو اپیل کرتی ہیں قلبی کیفیات کی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکیں۔ اس بات کا واضح ادراک امام غزالی رحمہ اللہ کو تھا اور آپ نے واضح کر دیا تھا کہ کلامی بحثیں تبدیلی قلوب کا ذریعہ نہیں بن سکتیں وہ معقولات عقائد اسلام اور ابطال عقائد و نظریاتِ کفر کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ایسے افراد جو اسلامی عقائد کی معقولیت اور ابطالِ عقائد و نظریات کفریہ کی ضرورت سے آشنا ہوں، نہایت محدود ہوتے ہیں۔ لہٰذا متکلم کا کام کبھی بھی اسلامی عوامی بیداری پیدا کرنا نہیں ہو سکتا۔

مولانا مودودی نے قیام پاکستان کے بعد اپنی سیاسی جدوجہد اس مفروضہ پر قائم کی کہ تحریک پاکستان ایک اسلامی تحریک تھی اور عوام بہ حیثیت مجموعی غلبہ دین کے متمنی ہیں۔ ریاستی نظام کی تسخیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ دستور اسلامی ہے۔ عدلیہ انتظامیہ فوج، مقننہ، نظام تعلیم اور ابلاغ عامہ میں اسلامی اصلاحات کی گنجائش اور امکان موجود ہے لیکن ان کی تحلیل اور ترتیبِ نو کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ نے جو جماعت بنائی اس کے پیش نظر نہ معاشرتی تغیر تھا نہ نظام اقتدار کی ترتیب نو۔ وہ ہٹلر کی فاشسٹ اور لینن کی کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح ایک دین گارڈ پارٹی تھی جو اپنے سیاسی تفوق کا دعوا اپنے نظریہ کی درستگی کی بنیاد پر کرتی تھی۔ معاشرے میں اس دعوے کی مقبولیت دلانے کے لیے ہٹلر اور لینن کو کسی نئی معاشرتی صف بندی کی ضرورت پیش نہ آئی اور ہٹلر کے جرمنی اور لینن کے روس میں ان جماعتوں کے حاضر نظام اقتدار پر تفوق حاصل ہو گیا۔ کسی نئے نظام اقتدار کی ضرورت انھیں پیش نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھی کہ جرمنی اور روس کے عوام سرمایہ دارانہ، حرص اور حسد کو دل سے قبول کرتے تھے۔ لہٰذا موجودہ نظام اقتدار میں ایک ایسی جماعت کا غلبہ جو انھی اہداف کے حصول کی ایک نئی حکمتِ عملی وضع کر رہی ہے بغیر کسی ہیئتی تبدیلی کے ممکن ہو گیا۔ ہٹلر اور لینن کی وین گارڈ پارٹیاں قائم شدہ ریاستی اور معاشرتی نظام پر غالب آ گئیں۔

پاکستان میں غلبہ اسلام کی جدوجہد کیسے برپا کی جائے؟

لیکن پاکستان میں غلبہ اسلام کی یہ حکمت عملی کام یاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت غلبہ اسلام کی ضرورت کی معترف ہے لیکن غلبہ اسلام نہیں چاہتی۔ اس چیز کو فلسفہ کی زبان میں Articulation of a second order desire کہتے ہیں۔ ایک عام آدمی چاہتا ہے کہ وہ غلبہ اسلام چاہے لہٰذا غلبہ اسلام کے اعمال سے قولی وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ فحاشی، سود خوری، زنا، تکاثر کے خلاف اور شریعت کے حق میں بیان دیتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا، حرام مال کھاتا ہے، فحش فلموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اپنی بیٹیوں سے نوکریاں کراتا ہے وغیرہ۔ ایک عام پاکستانی فاسق ہے منافق نہیں ہے۔ وہ گناہ کو گناہ سمجھ کے کرتا ہے اور جو گناہ سے پرہیز کرتے ہیں ان کی قدر کرتا ہے لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا۔ اس کی قلبی کیفیات میں تبدیلی کسی مرشد کی صحبت میں تزکیہ نفس سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ کلامی بحثیں اس ضمن میں بالکل لایعنی اور بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں رائج شدہ نظام اقتدار خالصتاً سیکولر ہے۔ پاکستان ایک ایسی سیکولر ریاست ہے جس نے اسلام کی سیاسی تعلیمات کو یک سر رد کر دیا ہے۔ یہ حربی کفار کی حلیف ریاست ہے اور جناح سے زرداری تک ہر دور میں استعمار کی حلیف اور باجگ گزار رہی ہے۔ یہ ریاستی نظام حرص اور حسد کے اقتدار کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اس ریاستی نظام کے ذریعے مقاصدِ شریعت اور ضروریاتِ دین کا حصول ایک دیوانے کے خواب کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سیکولر ریاست کی نظریاتی بنیاد مسلم قوم پرستی فراہم کرتی ہے اور تعجب اس بات پر ہے کہ وہی مولانا مودودی جو مسلم قوم پرستی کے سب سے اہم اسلامی ناقد تھے انھوں نے بھی ایسی جماعت بنائی جو آج مسلم قوم پرستی کی سب سے بڑی وکیل اور پاکستان کے قومی مفادات کو فروغ دینے کے لیے چینی استعمار کو گلے لگا کر مجاہدینِ اسلام کے ساتھ غداری پر آمادہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسلم قوم پرستی یہ امکان ضرور پیدا کرتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کی اسلامی توجیہہ مرتب کی جائے۔ مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' اسی نوعیت کی ایک کوشش ہے جس میں نمایندہ جمہوریت کو خلافت راشدہ سے مماثل بتایا گیا۔ جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی اسلام کاری کی ضرورت کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہ کام سب سے موثر انداز میں ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی نے دورِ حاضر میں کیا ہے اور بہ قول جارج بش نیٹو کی اسلامی پارٹی بن گئی ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ افغانستان میں امریکی فوج کی ذمہ داریاں ترکی کی ''اسلامی'' افواج ۲۰۱۴ء میں سنبھال لیں۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں اسلامی حکومت بنانا ممکن ہے، یہ بات ترکی، تیونس اور مصر کے انقلابات سے ثابت ہے۔ یہ سب سرمایہ دارانہ انقلاب تھے اور ان سب نے سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کا ایک اسلامی لبرل جواز فراہم کرنے والوں کو حکومت کرنے کا موقع دیا۔ کیا پاکستان کے سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں اسلامی حکومت قائم کی جاسکتی ہے؟ بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے کیوں کہ مسلم قوم پرستی کے اصلی اور فطری رہ نما نواز شریف اور عمران خان ہیں اور انھی کی جماعتوں کو عوامی پذیرائی حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کی ہیئتی تنظیم اور پالیسی سازی رائج شدہ غالب انفرادیت سے ہم آہنگ ہے۔

انھیں ذوقِ تلاوت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

مزکین اور مدرسین کی مساعی جلیلہ اور مجاہدین اسلام کی عدیم المثال قربانیوں کے نتیجے میں ملک میں اسلامی شعائر بھی تقویت حاصل کر رہے ہیں اور مسلم قوم پرست جماعتیں اس بڑھتی ہوئی مذہبیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اسلامی سیاسی جماعتیں اس بڑھتی ہوئی مذہبیت کو بنیاد بنا کر تحفظ اسلام کا کام آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور یہ کام قیام پاکستان سے لے کر اب تک سب سے موثر انداز میں جمعیت علمائے اسلام نے انجام دیا ہے اور اسی جماعت کی جدوجہد کے نتیجے میں مدارس اور مساجد ریاستی دست برد سے محفوظ رہے ہیں۔ نواز شریف اور عمران خان کی حکومتوں میں جماعت اسلامی بھی ایک موثر پریشر گروپ کا کردار ادا کرسکتی ہے اور دفاع اسلام کے فریضہ کی ادائیگی میں خدمات انجام دے سکتی ہے۔

لیکن اس حکمتِ عملی کو اپنا کر غلبہ اسلامی اور سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کی تحلیل ممکن نہیں ہے۔ یہی سبق ترکی اور مصر اور تیونس سے ہمیں ملتا ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ ایران اور سوڈان عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے محفوظ رہیں۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

خطرہ اس بات کا ہے کہ اسلامی جماعتیں بہ تدریج ماڈرن اور سیکولر ہوتی چلی جائیں اور ان کی تحفظِ دین کی صلاحیت میں کمی آتی چلی جائے۔ یہی نتیجہ سرمایہ دارانہ بینک کاری کی اسلام کاری کی کوشش سے ہوا۔ آج ''اسلامی بینک'' سرمایہ دارانہ زر کے بازاروں کا سب سے تیزی سے ترقی کرتا ہوا حصہ ہیں اور اس اسلامی بینک کاری کے نظام کے ذریعے اربوں ڈالر ہر مہینے امریکا اور یورپ منتقل ہو رہے ہیں کیوں کہ اس اسلامی بینک کاری کے نظام پر یہودی مالیاتی ادارے بالخصوص سٹی بینک، جے پی مورگن اور جارڈین فلیمنگ قابض ہیں۔ اس بات کا واضح خطرہ موجود ہے کہ جمہوریت کی اسلام کاری مجاہدینِ اسلام کے خلاف سرمایہ دارانہ War of Terror کو فروغ دینے کا ذریعہ بن جائے۔ لہٰذا ہمیں غلبہ اسلامی کی جدوجہد کو مرتب کرنا چاہیے۔ پاکستان میں غلبہ دین کی جدوجہد کو برپا کرنے کے لیے دو اقدام لازمی ہیں:

۱۔ مولانا مودودی کے سیاسی کلام کو ترک کیا جائے۔ مولانا مودودی کے علم کلام کی پیروی صرف جماعت اسلامی نہیں، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور سنی تحریک بھی ہے۔ یہ سب سرمایہ دارانہ جمہوریت کی اسلام کاری کر رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم اسلامی ائمہ سیاسیات، امام ماوردی، امام ابن خلدون، امام محمد، امام ابویعلیٰ کے علم کلام کی بنیاد پر اسلامی سیاسی آدرش مرتب کیے جائیں۔ ان تمام ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلامی ریاست کا اہم ترین فریضہ جہاد ہے۔ اسلامی ریاست ایک سوشل فلاحی ریاست نہیں ایک جہادی ریاست ہوتی ہے۔ ہمیں اسلامی نظام اقتدار اس طرح مرتب کرنا ہے کہ وہ جو شرع کے احکام کو نافذ نہیں کرتے اور علوم اسلامی کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرتے بہ تدریج اقتدار سے محروم ہوتے چلے جائیں۔ ریاستی قوت اہلِ دین کے ہاتھوں میں مرتکز ہو اور عوام و خواص اہل دین کی اطاعت پر راضی اور مجبور ہوتے چلے جائیں۔

۲۔ اس وقت ملک میں دین کا کام انتشار اور عدم تطبیق کا شکار ہے۔ مزکی اور صوفیا تزکیہ کا کام کر رہے ہیں۔ مدرسین اور مصلحین اسلامی معاشرتی تعمیر کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مجاہدین بلادِ اسلامی کو کفار سے پاک کرنے کے لیے عدیم المثال قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ اسلامی سیاسی جماعتیں شعائرِ اسلام کے تحفظ کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ لیکن یہ کام غیر مربوط ہے بل کہ بہت سے گروہ اپنے کام کو اقامتِ دین کے لیے کافی اور دوسرے گروہوں کی جدوجہد کو مضر اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بہت سا کام فرقہ واریت کی نظر ہو جاتا ہے اور اس آپس کی چپقلش کا فائدہ صرف دشمنانِ دین ہی کو ہوتا ہے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ملک میں اسلامی گروہوں کے کارکنوں کی تعداد کتنی ہے۔ فرض

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیجیے کہ یہ دو لاکھ مردوں پر مشتمل ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک معتدل اندازہ ہے۔ ۲۰۱۴ء میں جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد تیس ہزار تھی۔ کارکن سے میری مراد وہ فرد ہے جو کسی اسلامی نظم سے منسلک ہو اور کسی اسلامی امیر کا مطیع ہو، محتاط انداز کے مطابق تمام اسلامی جماعتوں کے کارکن جماعتِ اسلامی کے ارکان سے دس گنا زیادہ ہیں یعنی تین لاکھ۔ ہمیں اپنے معاشرتی اور ریاستی کام کو اس طرح مرتب کرنا ہے کہ اقتدار سرمایہ دارانہ عدلیہ، انتظامیہ، مقننہ، فوج، پولیس اور میڈیا کے اہل کاروں سے بہ تدریج منتقل ہو کر ان دو لاکھ کارکنان اسلامی کے ہاتھ میں آجائے۔ اس نظام اقتدار کا محور اور مرکز لازماً مسجد اور شہری اور علاقائی بین المسلکی وفاق ہوں گے جو مقامی، علاقائی اور شہری سطح پر ائمہ مساجد کی تحکیم کو منظم کریں گے اور بازار اور محلہ کی سطح پر ائمہ مساجد کی فیصلوں کی تنفیذ کا انتظام قائم کرنے کی سعی کی جائے گی۔ محلہ قصبہ، شہر، صوبائی اور ملکی سطح پر دارالافتا اور دارالقضا کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی اور مساجد کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے ایک بین المساجد ادارتی مشینری قائم کی جائے گی جس کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کو بہ تدریج معطل کیا جائے گا۔

یہ ریاست میں ریاست (State within a state) قائم کرنے کی ایک ایسی حکمت عملی ہے جس کی اہم ترین مثال سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں غلبہ دین کی جدوجہد سے ملتی ہے۔ بہ قول اسلامی مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قبل ایک مستحکم حکومت موجود تھی۔ یہ حکومت باقاعدہ وزرا نام زد کرتی تھی۔ اس حکومت کی ایک مقننہ تھی جس کو دارالندوہ کہتے تھے۔ چالیس سال سے بڑا ہر مرد باشندہ اس مجلس کا رکن ہوتا تھا اور اس سے حکومتی معاملات میں مشورہ کیا جاتا تھا۔ ابوجہل اس دارالندوہ کا رکن چالیس سال کا ہونے سے پہلے ہی منتخب کرلیا گیا تھا اور مرنے تک اس کا رکن رہا۔ یہ ادارہ بارہ وزرا نام زد کرتا تھا۔

لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں نے اس ادارہ مجلس ندوہ سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ انھوں نے اس نظام مشاورت اور عدلیہ سے علاحدہ ہوکر اپنے تمام مسائل میں فیصلے کے اختیارات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیے۔ بہ قول ڈاکٹر حمید اللہ:

"They made a state within a state. They did not expect any help, from their Makkah compatriots. They refered to the Prophet (Peace be upon him) who was their law-giver, their judge, their Commander-in-chief and their Sovereign.

The Emergence of Islam (1993), Islamic Research Institute Islamabad page n.157

''مسلمانوں نے مکہ میں ایک ریاست اندرون ریاست تعمیر کی۔ انھوں نے مکہ کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"امارت سے کسی تعاون کی توقع نہ رکھی۔ انھوں نے اپنے تمام معاملات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیے، وہ ان کے قانون داں، ان کے قاضی، ان کے رہنما اور ان کے حاکم اعلا تھے۔"

مدینہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ریاست قائم کی اس میں ندوۃ جیسی مقننہ کی کوئی گنجایش نہ رکھی بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفائے راشدین تمام اختیارات کے مالک تھے اور وہ صرف احکام الٰہیہ کے ماتحت تھے۔ کسی عوامی نمایندہ کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ آج مجاہدین اسلام صومالیہ، یمن، مالی، افغانستان، عراق، نائیجیریا، قفقاز، لبنان، شام اور کئی دیگر ممالک میں اسی نوعیت کی اسٹیٹ درون اسٹیٹ تعمیر کر چکے ہیں اور عرصہ دراز سے انھیں کام یابی سے چلا رہے ہیں۔

بین المسالک وفاق المساجد کی بنیاد پر ہم ایک اسلامی انتظامیہ، عدلیہ اور دفاع کے نظام بہ تدریج قائم کریں گے اور کوشش کریں گے کہ سیکولر ریاستی ادارے اس اسلامی نظام کے اقتدار کو علاقائی سطح پر تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔ ایک حد تک اس نوعیت کے فوائد بلوچ قبائل کے علاقوں میں حاصل ہو چکے ہیں جہاں سول عدلیہ اور انتظامیہ جرگہ کے فیصلوں کو قبول اور نافذ کرنے پر پشت ہا پشت سے مجبور چلی آتی ہیں۔

اس اسلامی ریاست کی تعمیر اور کارکردگی کی ذمہ داری مزکی، تدریسی، تبلیغی اور سیاسی اسلامی جماعتوں کے ان دو لاکھ مخلص کارکنوں کو سونپی جائے گی جنھوں نے اپنی زندگیاں اسلامی قائدین خواہ مزکی گروہوں کے قائد ہوں تبلیغی گروہ ہوں یا سیاسی جماعتوں کے، کے سپرد کر دی ہیں ہر کارکن کو اس قابل بنانے کی سعی کی جائے گی کہ وہ کم از کم تین سو مردوں کو اپنا مطیع اور مرید بنا سکے۔ ملک کی آبادی انیس کروڑ ہے۔ اس میں مرد تقریباً اکیاون فی صد ہیں اور بچے پندرہ سال سے کم عمر والے چالیس فی صد ہیں لہٰذا بالغ مردوں کی تعداد پانچ اعشاریہ آٹھ کروڑ بنتی ہے۔ پانچ اعشاریہ آٹھ کروڑ کو دو لاکھ (اسلامی تحریکات کی متوقع تعداد سے ضرب دیں تو دو سو اکیانوے مرید فی اسلامی رہبر بنتے ہیں۔ اس نظام کا کام یاب تجربہ تحریک حزب اللہ نے جنوبی لبنان میں کیا ہے اور اس کے نتیجے میں اتنی موثر انتظامیہ قائم کی ہے کہ عسکری میدان میں اسرائیلی مداخلت کو منہ توڑ جواب دینے کے قابل اور مقامی لبرل ریاستی انتظامیہ کو اپنی بالادستی قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

تمام تحریکات اسلامی کے کارکن نہایت مخلص، وفادار جاں نثار اور باصلاحیت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی جماعتوں میں یہ عام کارکن راندۂ درگاہ رہتے ہیں، ہماری قیادتوں کی توجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باہر والوں کی طرف زیادہ رہتی ہے اور اپنے عام کارکنوں کی قربانیوں اور مستقل حاضر رہنے والوں کے ایثار اور اخلاص کی اتنی قدر نہیں کرتیں جتنی کی جانی چاہیے۔ تعمیر ریاست کی حکمتِ عملی کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہماری قیادتوں کی توجہات عوام سے کہیں زیادہ اپنے مخلص اور جاں نثار کارکنوں کی استعداد میں اضافہ اور ان کے مسائل کے حل کی طرف مبذول ہونی چاہیے۔ اگر کارکنوں کو علاقائی ریاستی قیادت فراہم کرنے کا اہل بنانا ہے تو مندرجہ ذیل اقدام ناگزیر ہیں:

۱۔ کارکنان کے معاش کی ذمہ داری اسلامی تحریکات کو قبول کرنا پڑے گی۔ ہمیں دو لاکھ افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا ہوگا، یاد رکھیے جس نظام کفر سے ہمارا سابقہ ہے وہ سرمایہ داری ہے اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی ہے وہ فرد کو سرمایہ کے چکر میں پھنسا کر ہی انفرادیت کو مغلوب کرتا ہے۔ جب تک فرد اس سرمایہ کے چکر میں گرفتار ہے خواہ منیجر کی حیثیت سے، خواہ تاجر کی حیثیت سے خواہ اجرتی مزدور کی حیثیت سے، خواہ ریاستی پالیسی ساز اور منتظم کی حیثیت سے، وہ سرمایہ دارانہ عقلیت کی مغلوبیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ تمام اسلامی کارکنوں کو سرمایہ کے چکر سے چھٹکارا دلائے بغیر ان کو علاقائی اسلامی ریاستی قیادت کی ذمہ داریاں نہیں سونپی جاسکتیں۔

پاکستان میں دو لاکھ افراد کو سرمایہ کے چکر سے نکالنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہاں نوے فی صد کاروبار سرمایہ کے چکر سے باہر ہے۔ اس کا تعلق سود کے بازار سے ہے نہ سٹہ کے بازار سے۔ یعنی ملک کی پچاسی فی صد آبادی بینک کاری کے نظام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ ننانوے فی صد آبادی نے سٹہ کے بازار کا نام بھی نہیں سنا۔ بلاواسطہ ٹیکس دینے والی آبادی کا اڑھائی فی صد بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تحریکات سے متعلق کاروباری ادارے، اسکول، مدارس، اوقاف، دکانیں، ارضیات، لاکھوں افراد کو روزگار فراہم کرتی ہیں اور الحمدللہ یہ کاروبار بالکل غیر سرمایہ دارانہ ہے اور اسلامی بینک اس کاروبار کو اپنی گرفت میں لے کر سرمایہ کے چکر میں شامل کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں (دیوبندی علما کے فتوے کے نتیجہ میں)۔ اگر ہم چاہیں تو با آسانی تحریکات اسلامی سے وابستہ کاروبار میں اپنے تمام کارکنوں کو شامل کر سکتے ہیں اور اس کاروبار کو توسیع دینے کی ایک قابل عمل تجویز جناب محمد یونس قادری نے مرتب فرمائی ہے اس تجویز کو جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے سامنے پیش بھی کیا جاچکا ہے۔

۲۔ کارکنوں کے خاندانی روابط کو فروغ دینا اور اس بات کا انتظام کہ نوجوان کارکنوں کی شادیاں تحریکات اسلامی کے کارکنوں کے گھرانوں میں ہی ہوں۔ تحریکات اسلامی کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادغام اور معاشرتی استحکام کے لیے یہ عمل نہایت ضروری ہے جیسا کہ ملائشیا کی تحریکات ثورا السلام، دارلارقم اور حزب اللہ کے تجربات سے ثابت ہے۔

۳۔ کارکنوں کی مقامی حالات سے واقفیت اور ہم آہنگی میں اضافے کی کوشش کرنا تاکہ Ethnographic اور عمرانی تجزیات کی صلاحیت پیدا ہو سکے اور کارکن اس قابل ہو سکیں کہ دعوتی اور تنظیمی حکمت عملی مقامی ماحول سے ہم آہنگ ہو اور علاقہ کے لوگ اس سے مانوس ہو جائیں۔ یہ ایک نہایت اہم ضرورت ہے اور اسلامی رسوم اور رواج کا فروغ اور تطہیر کا وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے ہم سرمایہ دارانہ معاشرت کو علاقائی سطح پر اجنبی بنا کر جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں۔

اس معاشرتی ریاستی حکمتِ عملی کو بروئے کار لانے کی ہمہ جہت جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ کام مزکی، مدرس، تبلیغی اور سیاسی جماعتیں مل کر ہی کر سکتی ہیں کوئی جماعت اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی۔ مختلف جماعتوں کے کام کے تطبیق کے لیے ایک رابطہ کی جماعت کی یقیناً ضرورت ہے اور جماعتوں کے کام میں تطبیق پیدا کرنے کا کام سیاسی جماعتوں کا اصل کام ہے اور ان کو تطبیق کی یہ ذمہ داری سنبھال لینی چاہیے۔ کام کی تطبیق وہی کلامی اجتہاد ہے جو مولانا مودودی نے پیش کیا یعنی:

۱۔ ''اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے، اسے کسی دوسرے نظام میں ضم نہیں کیا جا سکتا۔''

۲۔ مغربی علمیت، مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب جاہلیت خالصہ ہے، اس سے کسی سمجھوتے اور ''پرامن بقائے باہمی'' کی گنجایش نہیں۔

مولانا مودودی کی سیاسی فکر کو رد کرنا مولانا مودودی کی اساسی فکر کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ مولانا مودودی کی سیاسی فکر کو رد نہ کیا گیا تو دو میں سے ایک نتیجہ ناگزیر ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو:

۱۔ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان (جو تینوں مولانا مودودی کی سیاسی فکر کو اپنائے ہوئے ہیں) محض پریشر گروپ بن جائیں گی اور ان کا اثر اصل مسلم قوم پرست جماعتوں، مسلم لیگ اور تحریک انصاف تک محدود ہو جائے گا۔

۲۔ یہ اسلامی سیاسی جماعتیں ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی طرح ماڈرن مسلم قوم پرست جماعتیں بن رہی ہیں، مزکی، مدرسین، مبلغ اور جہادی اسلامی گروہوں سے ان کے روابط کم زور سے کم زور ہوتے چلے جائیں گے اور وہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایسی اسلامی حکومتیں ہوں گی جو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا شرعی جواز پیش کریں گی۔ اللہ تعالیٰ اسلامیانِ پاکستان کو اس المیہ سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

تحریک احرار اور جماعت اسلامی

کیا آج کی جماعت اسلامی کل کی تحریک احرار بنتی جارہی ہے؟

تحریکات کا برپا ہونا اور ان کا منتشر ہوجانا ایک تاریخی عمل ہے۔ چوں کہ تحریکیں تاریخی ہوتی ہیں لہٰذا وہ لازماً دائمی نہیں ہوتیں، حادثاتی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اعتقادات، عبادات اور احکامِ شرع دائمی ہیں۔ وہ تاریخ سے ماورا ہیں۔ اور تاریخی تغیرات سے ان اعتقادات، عبادات اور احکام کی ماہیت اور تشکیل میں کوئی فرق نہیں آتا: نماز ویسے ہی پڑھی جاتی ہے جیسے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پڑھی جاتی تھی، خلیفہ کے وہی فرائض ہیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھے وغیرہ۔ اس کے برعکس تحریکات اعتقادات اور احکامات شرع کی ایسی تشریح پیش کرتی ہیں جو:

۱۔ اسلامی تہذیبی تاریخی تواتر کو قائم رکھیں اور،

۲۔ ان کے اپنے دور کے مخصوص مسائل کا اسلامی روایتی تشریح ممکن ہو۔ ان معنوں میں تحریکات اسلامی تاریخ ساز بھی ہوتی ہیں اور تاریخی ردِ عمل کا اظہار بھی ہوتی ہیں۔

تحریکات اسلامی اپنے تنظیمی تشخص کو دائمی بنانے کے لیے قائم نہیں ہوتیں۔ وہ تحفظ دین اور غلبہ دین کے لیے قائم کی جاتی ہیں اور اگر ایک مخصوص تنظیمی تشخص تحفظ اور غلبہ دین کے فریضہ کی انجام دہی میں رکاوٹ بن جائے تو کوئی دوسری اسلامی تحریک پرانی اسلامی تحریک کی جگہ لے لیتی ہے یہ بات امام ابن خلدون رحمۃ اللہ نے اسلامی سلطنتوں کے تبدل کے ضمن اچھی طرح سمجھا دی ہے اور امام موصوف نے ثابت کیا کہ عموماً اسلامی سلطنتوں میں تبدل غلبہ دین کی جدوجہد کے نتیجے میں رونما ہوا ہے۔

اسلامی تحریکات کے تنظیمی تشخص کا انجماد پریشان کن ہے کیوں کہ یہ انجماد اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ تحریک اپنی سابقہ تاریخ کی قیدی بن گئی ہے اور اس میں تحفظ اور غلبہ دین کے جو مواقع آج پیدا ہورہے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی استعداد ناپیدا ہوتی جارہی ہے۔ جب تک ایک اسلامی تحریک اپنے نظریات اور اپنی تنظیمی ہیئت میں ایسی تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں غلبہ دین اور تحفظ دین کا فریضہ موثر طور پر ادا کرتی رہے وہ اپنا وجود اور تشخص قائم رکھتی ہے۔ جب وہ یہ صلاحیت کھودیتی ہے تو ایک فرقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور ایک محدود پریشر گروپ بن جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ہمہ گیر اسلامی تحریک لے لیتی ہے۔ نظریاتی اور ساختی تغیرات کے ذریعے ہی ایک تحریک اپنی تاریخی افادیت کا اظہار کرتی ہے۔ نظریاتی اور ساختی تبدیلیوں کو شجر ممنوع سمجھنا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ تحریک کی قیادت ناقص العمل ہے اور یہ تاریخی طور پر کالعدم ہو کر اپنی طبعی موت مرنے والی ہے۔

تحریک احرار اور جماعت اسلامی کا تاریخی موازنہ کر کے اس اجمال کی تفصیل بیان کی جاسکتی ہے۔ میں اس مضمون میں پہلے اس تاریخی عمل کا جائزہ لوں گا جس کے نتیجے میں تحریک احرار ایک ملک گیر انقلابی تحریک سے ایک محدود ایک نکاتی یعنی ردِ قادیانیت کے ایجنڈا پر انحصار کرنے والی جماعت بن گئی۔ پھر جماعت اسلامی کی موجودہ جدوجہد کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ کس حد تک جماعت اسلامی تحریک احرار کی راہ پر گام زن ہے۔ آخر میں چند تجاویز پیش کروں گا جن کو اپنا کر جماعت اسلامی اپنے نظریات اور تنظیمی ساخت میں وہ تبدیلیاں لاسکتی ہے جو اس کی تاریخی فعالیت اور افادیت تحفظ اور غلبہ دین کے ایک ذریعے کے طور پر برقرار رکھ سکتی ہے۔

تحریک احرار کا عروج وزوال

تحریک خلافت کی ناکامی اور مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے انگریزوں سے بڑھتے ہوئے تعلقات کے نتیجے میں ۱۹۲۸ء [1] سے پنجاب خلافت کمیٹی مرکز سے علاحدہ کر دی گئی۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں احراری علما کانگریس میں شامل ہوگئے اور گاندھی کی تحریک ستیہ گراہ میں بھرپور حصہ لیا لیکن کانگریس سے اشتراک عمل دیرپا نہ ثابت ہوسکا۔ ۱۹۳۱ء میں احرار نے اپنی پہلی کانفرنس لاہور میں منعقد کی اور کانگریس کی ناراضگی کے باوجود مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد کی دو عشروں کی تاریخ احرار مہمات کی تاریخ ہے۔ ان میں تحریک کشمیر ۱۹۳۲ء کی کیمبل ایوارڈ کے دفاع کی تحریک ردِ قادیانیت کی تحریک (جو کئی بار چلائی گئی تھی) مسجد شہید گنج کی تحریک، مغل پورہ کالج ایجی ٹیشن، کپورتھلا کی تحریک اور لکھنؤ کے شیعہ سنی اتحاد کے فروغ کی تحریک شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کانگریس کی چلائی ہوئی ستیہ گراہ اور سول نافرمانی کی تحریکوں میں بھی احرار نے جزوی حصہ لیا۔ کانگریسی اس شمولیت اور معاونت سے مطمئن نہ ہوئے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۲۰ء کی دہائیوں میں کانگریس اخبارات احرار پر

[1] مولانا شوکت علی رحمہ اللہ نے اسی سال پنجاب کی خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیا اور علما کی طرف سے احرار پر پنجابی ٹولے کی پھبتی کسی جانے لگی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کڑی تنقید کرتے رہے۔

تحریک احرار کے عروج کا دور ۱۹۳۰ء کی دہائی ہے۔ اس دور میں انھیں پنجاب میں عوامی پذیرائی حاصل رہی اور بلاشبہ پنجاب میں سب سے طاقت ور استعمار مخالف قوت کے طور پر ابھرے لیکن پنجاب سے باہر احرار کبھی بھی اپنا انتظامی ڈھانچہ قائم نہ کر سکے اور نہ عوامی پذیرائی حاصل کر سکے۔ یہ ایک عجیب سانحہ ہے کیوں کہ حضرت امیر شریعت نے اپنا زیادہ وقت سارے ہندستان کے دورے کرتے ہوئے گزارا۔ ان دوروں سے کیا حاصل ہوا؟ محض جزباتیت کا وقتی اظہار جس کی بنیاد پر کوئی مستحکم ادارتی صف بندی نہ کی جا سکی۔

استعمار مخالفت میں احرار نے ہندستان کے تمام دوسرے گروہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قربانیاں دیں؛ کارکن شہید ہوئے، اکابر رہ نماؤں نے کئی کئی سال بدترین قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں، استعمار اور اس کے حلیفوں سے محض مادی مفادات کے حصول یا فروغ کے لیے ادنا سے ادنا سمجھوتا نہ کیا۔ احرار کی کچھ تحریکیں ان معنوں میں کام یاب بھی ہوئیں کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے احرار نے یہ تحریکات چلائی تھیں وہ کم از کم جزواً حاصل بھی کر لیے گئے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول سے احرار مخالف قوتوں بالخصوص کشمیر کے پیشہ وارانہ ریاستی مسلم سیاست دانوں اور پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں ہی کو فائدہ ہوا۔ احرار کو خود کوئی دائمی فائدہ نہ ہوا۔

یہ تحریک ان معنوں میں ناکام ہوئی کہ جس عوامی جوش و جذبہ کی بنیاد پر تحریک برپا کی گئی تھی وہ جوش و جذبہ تحریک نے ضائع کر دیا۔ انقلابی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک دائمی نہیں ہو سکتی اور جس جذباتی اثاثہ کی بنیاد پر تحریک ابھرتی ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اثاثہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تحریک کو تنظیم میں سمو دیا جائے اور تحریک کے اختتام پر ایک انقلابی نظام اقتدار قائم ہو چکا ہو جو کہ سرمایہ دارانہ/ استعماری ریاستی قوت کو منتشر کر کے بہ تدریج اپنے فیصلوں کی تنفیذ کی صلاحیت میں اضافہ کرے۔ تحریک کی ناکامی کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے برپا کرنے کے مقاصد کے حصول کے بغیر وہ ختم ہو گئی اور عوام اپنے روزمرہ کی مشغولیات میں مصروف ہو گئے۔ وہ تحریکیں بھی ناکام ہوتی ہیں جن کے مقاصد حاصل ہو گئے لیکن ان کے اختتام تک ایک انقلابی نظام اقتدار قائم نہ کیا جا سکا مثلاً ۱۹۳۰ء کی تحریک کشمیر اور ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ چوں کہ تحریک احرار عام متوسط طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی معاشرتی جڑیں موجود تھیں یہ بات اس کی رفاہِ عام کی مہمات، زلزلہ زدگان کوئٹہ کی امداد، فسادات بہار میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اعانت مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجرین کی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں مدد سے ظاہر ہوتی ہے لیکن ان مہمات سے بھی کوئی معاشرتی ادارتی صف بندی نہ ہوسکی اور احرار کی معاشرتی جڑیں مضبوط اور مستحکم نہ کی جاسکیں۔

عوام میں موجودگی اس بات کی ضمانت نہیں کہ کوئی گروہ عوامی حمایت حاصل کرلے گا۔عوامی حمایت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں:

۱۔ یا تو عوامی خواہشات اور میلانات کو قبول کرلیا جائے اور اپنی جدوجہد سے ثابت کیا جائے کہ ان عوامی خواہشات کی تکمیل کے لیے یہ تحریک سب سے زیادہ اہلیت رکھتی ہے۔

۲۔ یا عوام کی خواہشات و میلانات کو تحریک کے اقدار اور مقاصد کے مطابق بنایا جائے۔عوام کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ آخرت میں نجات حاصل کرنے کی تیاری نہیں کر رہے ہیں اور ان کی زندگی معاصی سے بھری ہوتی ہے۔صوفیائے کرام نے یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا اور اس کے نتیجے میں ان کو ہمہ گیر عوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔کروڑوں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔آج کے دور میں بھی ہر سال ایک لاکھ ہندو مسلمان ہو رہے ہیں اور اس میں ہندستان کے مولانا کلیم صدیقی کا کام نہایت قابل تحسین ہے۔

لیکن برصغیر کی اسلامی انقلابی تحریکیں اس قسم کا عوامی تحرک پیدا کرنے سے قاصر رہی ہیں۔سب سے نمایاں ناکامی سید بادشاہ اور علمائے صادق پور کی تحریکوں کی ہے۔سید احمد شہید رحمہ اللہ عوامی روحانی بیداری پیدا کرنے میں تو کام یاب ہوگئے اور یہ بات علمائے صادق پور کے بارے میں کہی جاسکتی ہے لیکن جہاد ان علاقوں میں نہیں کیا جہاں یہ بیداری پیدا ہوئی تھی بل کہ ایسے علاقے میں کیا جس کے عوام نے تحریک کے روحانی تاثیرات قبول نہیں کیے تھے لہٰذا اسلامی اقتداری نظام مستحکم نہ ہوسکا۔

صوفیا کی پشت پناہ اسلامی سلطنتیں تھیں جنھوں نے اسلامی روحانیت اور اخلاقیات کے عوامی فروغ کو بنیاد بنا کر اسلامی نظام اقتدار قائم اور مستحکم کیا۔انیسویں اور بیسویں صدی کی اسلامی تحریکات کو سیکولر ریاستی نظام کو منہدم کرکے اسلامی نظام اقتدار خود قائم کرنا ہے۔ عوامی سطح پر اسلامی نظام اقتدار قائم کرنے کی احرار نے کوئی کوشش نہ کی اور اسلامی عصبیت کو فروغ دینے کے لیے اس نے استعمار سے نفرت کے جذبہ کا سہارا لیا۔ نفرت ایک منفی جذبہ ہے اس کی بنیاد پر تعمیر نہیں ہوتی۔نفرت کا حسد سے فطرتی ربط ہے لہٰذا نفرت پر قائم مہمات سرمایہ درانہ نظام اقتدار منہدم نہیں کرسکتیں کیوں کہ حسد ایک بنیادی سرمایہ دارانہ قدر ہے۔ردِ قادیانیت کی عوامی تحریک استعماری ریاستی گرفت کم زور تو کرسکتی ہے، اسلامی ریاستی صف بندی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کبھی نہیں کرسکتی۔ اس قسم کی تحریک کی کام یابی کے نتیجے میں قادیانی اور ان کے استعماری آقا سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار سے بے دخل تو کیے جاسکتے ہیں لیکن اس نظام اقتدار کو منہدم نہیں کیا جاسکتا۔ محض یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں قادیانیوں اور استعماریوں کی جگہ مسلمان قوم پرست لے لیتے ہیں۔

جب کوئی تحریک عوامی سطح پر اپنا نظام اقتدار قائم نہیں کرپاتی تو وہ موجودہ نظام اقتدار میں شمولیت پر مجبور ہوجاتی ہے۔ بیسویں صدی میں اس شمولیت کا اظہار انتخابات میں حصہ لے کر کیا جاتا ہے۔ احرار نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے کل ہند انتخابات میں مجبوراً حصہ لیا۔ شاہ جی بہ ذات خود ان انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف تھے لیکن انتخابی مہم کے دوران احرار امیدواروں کے حلقوں میں تقریریں کرتے پھرے۔ ۱۹۴۴ء میں احرار نے ''حکومت الٰہیہ'' کا جو تصور پیش کیا اس کا عوامی رجحانات، میلانات اور زمینی حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات تک یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ احرار نے جو عوامی تحرک پچھلی دو دہائیوں میں ابھارا ہے اس کی بنیاد پر ریاستی ادارتی صف بندی ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد شاہ جی نے تحریک احرار کے سیاسی وجود کو ختم کرکے احرار کے کارکنوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کا مشورہ دیا، جماعت اسلامی میں شمولیت کا مشورہ نہ دیا حال آں کہ آپ میاں طفیل محمد اور جناب نصراللہ خان عزیر کو جماعت اسلامی میں بھیج چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی ردِ قادیانیت کی مہمات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس نوعیت کی تحریکات کو سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار با آسانی اپنے اندر ضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مہماتی سیاست استعماری قوتوں کو اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ انقلابی تحریکات میں گھس بیٹھیے داخل کریں۔ برطانیہ، کانگریس، یونی نسٹ پارٹی اور اشتراکیوں نے تحریک احرار میں ''دخول'' کا عمل ۱۹۴۳ء سے شروع کردیا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں احرار میں ایسے ہزاروں ''کارکن'' شامل ہوگئے تھے جو جیل تو کبھی نہ جاتے تھے اور جو قربانی و ایثار، جذبہ و اعتقاد میں تو عام احرار سے کوسوں پیچھے تھے لیکن اثر و رسوخ اور دولت و منصب میں ان سے کوسوں آگے تھے۔ مسلم لیگ نے اور کانگریس نے احرار کو کبھی اپنا نہ سمجھا۔ دونوں جماعتیں سیکولر تھیں اور فطرتاً احرار کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی تھیں۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک میں مسلم لیگ کی حکومت نے احرار کو خلاف قانون قرار دے کر کارکنان پر بدترین مظالم ڈھائے۔

انھی گھس بیٹھیوں نے مسلم لیگ میں تحریک احرار کے ادغام کی راہ ہم وار کی۔ چودھری افضل حق کے انتقال کے بعد احرار میں کوئی نظریاتی قیادت موجود نہ رہی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوا کہ تاریخ نے احرار کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آج بھی احرار ۱۹۲۰ء کے زمانے میں رہتے ہیں جب کہ ۱۹۶۰ء میں مسلم عوام حقوق کے طالب نہ تھے بل کہ سیاسی جدوجہد کو دینی شناخت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ آج حقوق کی سیاست اتنی عام ہے کہ گدی نشین پیر زادہ بھی پیپلز پارٹی کے وزیر بن گئے ہیں۔ عوامی میلانات کے اس انقلاب کو احرار Theorise نہ کر سکے لہٰذا عوام کی روزمرہ کی زندگی کا احرار کی جدوجہد سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

انقلابی تحریکیں نظریاتی تحریکیں ہوتی ہیں، اعتقاداتی تحریکات نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند نے تحریک احرار کا کبھی ساتھ نہ دیا اور جمعیت علمائے ہند سے کیا شکایت دیوبند نے تو صادق پوری علما اور تحریک ریشمی رومال سے قطعاً لاتعلقی برتی تھی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما، امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے خروج سے لاتعلق رہے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ اور امام عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا کوئی علمی کارنامہ تاریخ میں رقم نہیں لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں اسلامی ریاست اور حکومت بارہ سو سال تک قائم رہی اور شریعت اور علوم اسلامی کا نظامیاتی غلبہ قائم رہا۔ ہر سلطان امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا پیرو ثابت ہوا اور جیسا کہ امام ابن خلدون نے تحریر فرمایا ہے، اسلامی عصبیت کی بنیاد پر ہی سلطنتی تغیرات رونما ہوتے رہے۔

علما انقلابی تحریکات کا ساتھ نہیں دیتے کیوں کہ انقلابی تحریکات نظریاتی ہوتی ہیں۔ وہ مستقبل کا ایک مخصوص تصوراتی خاکہ مرتب کرتی ہیں اور حال کو اس مستقبل میں ڈھالنے کی حکمت عملی وضع کرتی ہیں۔ یہ حکمت عملی ہمیشہ جزواً کام یاب اور جزواً ناکام ہوتی رہتی ہے اور ان کام یابیوں ناکامیوں کی بنیاد پر نظریاتی ترمیم و تنسیخ کا عمل مستقلاً جاری رہتا ہے۔ اگر کسی انقلابی تحریک کا نظریہ منجمد ہو جائے، ۱۹۴۰ء کے دور میں پیدا شدہ نظریات کی بنیاد پر ۲۰۱۳ء کی حکمتِ عملی وضع کی جائے تو وہ اپنی تاریخ کی قیدی بن جاتی ہے اور اس کا معاشرتی و ریاستی غلبہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ تحریک احرار کو جو سب سے بڑا سانحہ پیش آیا وہ یہ کہ چودھری افضل حق کا کوئی جانشین نہ ملا۔ چودھری افضل حق مسلم قوم پرستی کے نظریاتی غلبے سے پریشان تھے اور اپنے آخری ایام میں احرار کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ اس نظریے کے ادراک اور تجزیے کی ضرورت ہے لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۸ء تک احرار مسلمانوں کی طاقت ور ترین تحریک تھی لیکن صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پنجاب میں اور ان کا ایک نکاتی ایجنڈا استعمار مخالفت تھا۔ احرار بہ تدریج ایک غیر اثر گروہ بنتے چلے گئے اور اپنی تحریکوں میں تضاداتی اعتقاداتی بیان سے گریز نہ کرتے تھے۔ اپنی کٹر مذہبیت کے باوجود کانگریس، یونی نسٹوں° اور یہاں تک کمیونسٹ دہریوں سے اشتراک عمل روا رکھتے تھے۔ ان کی تنظیم اس قدر سیال تھی کہ فیصلوں کے سرچشموں کا تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ان داخلی کمزوریوں کی بنا پر احرار ایک طاقت ور انقلابی جماعت سے ایک محدود ذاتی تعلقات کے نیٹ ورک میں تبدیل ہو گئی جو مہماتی سیاست سے بھی بے دخل کر دی گئی اور اب محض ایک پریشر گروپ ہے۔

جماعت اسلامی تحریک احرار کی راہ پر گام زن؟

جماعتِ اسلامی تحریک احرار کی جانشین جماعت ہے۔

کھلا پھر ہاتھ میں دیکھو میرے احرار کا پرچم
خدائے عزوجل کا احمد مختار کا پرچم

اس کے دو اہم ثبوت ہیں۔ ایک یہ کہ احرار کے تصورِ حکومت الٰہیہ کو پاکستان میں جماعت اسلامی کی سیاسی جدوجہد نے زندہ رکھا ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کی سیاست نے نہیں کیوں کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں شرکت کے ذریعے تحفظِ مدارس، مساجد اور اسلامی نظام تعلیم کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ احرار کی استعمار مخالفت کا اظہار آج جماعت اسلامی کی امریکا مخالفت میں ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان بھی ایک استعمار مخالف تنظیم اور مجاہدین اسلام بھی استعماری قوتوں سے نبرد آزما ہیں لیکن خواہش کے باوجود یہ نظاماتی تبدیلی کے محرک نہیں ہو سکتے۔

احرار اور جماعت میں سب سے بنیادی فرق دونوں تحریکوں کا نظریاتی تناظر ہے۔ جماعت اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی انقلابی دعوت کا محور و مرکز اس کے نظریات ہیں (عقائد نہیں) یہی اس کی انقلابیت کا ماخذ ہے۔ مولانا مودودی نے اپنے نظریات کی بنیاد پر نظاماتی تغیر کا خاکہ مرتب فرمایا ہے اور برصغیر میں یہ کام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بعد کوئی اور جماعت بہ شمول احرار نہ کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ غلبہ دین کی جدوجہد میں جماعت کی مرکزی اہمیت ہے۔ مولانا مودودی کا یہ تصوراتی خاکہ دو کلیدی اجتہادات پر مبنی ہے۔

۱۔ اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام حیات ہے۔

۲۔ مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

° ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں یونی نسٹوں اور کمیونسٹ امیدواروں کو کچھ حلقوں میں احرار کی حمایت حاصل تھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پہلا تصور تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کی حجت اللہ البلاغہ سے ماخوذ ہے لیکن دوسرا مولانا مودودی کا خاص اجتہاد ہے، مولانا مودودی سے قبل کسی نے بھی مغرب کو جاہلیت خالصہ نہیں کہا تھا۔ علمائے دیوبند اور بریلی نے اس مسئلے سے سہوِ نظر کرلیا تھا اور خاموش رہے تھے۔ ہمارے مذہبی دانش ور علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر حالی، شبلی وغیرہ مغربی تہذیب کے کسی ایک آدرش کو اسلامی عقلیت کا اظہار گردانتے تھے۔ مثلاً اپنی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) میں علامہ اقبال نے Empiricism (تجربیت) کو اسلامی فکری پرتو قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کی تردید میں اپنی کتاب اسلامی "تہذیب اور اس کے اصول ومبادی" تحریر فرمائی۔

سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، امیر علی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا یہ تو انگریزوں کے تنخواہ دار ملازم تھے اور اسلامی دہریت Islamic Secularism کے ائمہ تھے۔ یہ مولانا مودودی ہی ہیں جنھوں نے برملا اور بہ بانگِ دہل مغرب کو جاہلیت خالصہ بار بار کہا۔ دیکھیے اسلام اور جاہلیت، اسلام کا نظامِ حیات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، اور تنقیحات۔

ان دو اجتہادات کی بنیاد پر آپ نے غلبہ دین کو ممکن بنانے کے لیے تنظیم سازی کی۔ پہلے ۱۹۳۷ء میں "دارالسلام پٹھان کوٹ" قائم کیا، ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کی۔ اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر دارالسلام پٹھان کوٹ میں ہی قائم رہا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک جماعت اسلامی نے ریاستی جدوجہد میں حصہ نہ لیا بل کہ تنظیم سازی اور ہندستانی اور مسلم قوم پرستی کی نظریاتی تردید مشتہر کرنے پر زور دیا گیا۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ جماعت کے تاسیسی اجلاس کی جو بحثیں رودادِ جماعت اسلامی حصہ اول میں ملتی ہیں وہ خالصتاً معروضی ہیں، برصغیر میں برپا ہونے والی غلبہ دین کی تحریکات کا کوئی ذکر نہیں یہاں تک کہ اس وقت کی جاری غلبہ دین کی تحریک یعنی احرار کا بھی ذکر نہیں حال آں کہ احرار کے ایک بانی مولانا داؤد غزنوی تاسیسی اجلاس میں شریک تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جماعت کے اپنے دستور میں اہم تبدیلیاں آئیں اور ۱۹۴۶ء میں منظور شدہ دستور میں آج تک اساسی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ دستور سے متعلق بحث جماعت کی داخلی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ تاسیس کے فوراً بعد تو جماعت دیوبندی علما بالخصوص مولانا تھانوی اور مولانا علی میاں جماعت کو چھوڑ گئے اور غلبہ دین کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کو مولانا مودودی کی شخصی کم زوریوں پر اعتراض تھا اور مولانا مودودی کو تحریک اسلامی کی قیادت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ تحریک غلبہ دین سے پہلو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھی کا انھوں نے یہ بہانہ بنایا کہ کوئی آئیڈیل امیر موجود نہیں ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جو دستور بنایا اس کا مقصد امیر کے مقابلے میں شورا کے اختیار میں توسیع تھی تاکہ مولانا مودودی کی گرفت کو محدود کیا جاسکے۔ اس دستور نے جماعت کو ایک Democratic Centralist Party بنادیا ہے۔ Democratic Contralist Party کا تصور لینن کا ہے۔ Democratic Centralist Party پارٹی اپنے آپ کو معاشرہ میں افضل اس لیے سمجھتی کہ اس کا جو نظریہ ہے وہ سائنٹفک سمجھا جاتا ہے اور جو اس نظریہ کو نہیں سمجھتے وہ قیادت کے اہل نہیں۔ چوں کہ پارٹی کا ہر ممبر اس سائنٹفک نظریہ کو سمجھتا ہے لہٰذا وہ سب برابر ہیں اور پارٹی اپنے اندر مکمل جمہوریت کو Institutionalize کرتی ہے۔ پارٹی کے فیصلوں پر ہر تنقید ممنوع ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک جماعت نے نظام ریاست میں دخول کا طریقہ کار اپنایا ہے۔ پہلے مرحلے میں وہ مسلم لیگ اور ایوب خان کی ایک اہم سیاسی حریف کے طور پر ابھری اور اس نے احرار کی عوامی جدوجہد کو جاری رکھنے کی صلاحیت کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں جماعت کے پریس، آئین، "ایشیا"، "تسنیم" اور "بتول" پر احرار کا اثر واضح نظر آتا ہے۔ لیکن اس رویے سے ریاستی نظام میں دخول ممکن نہ ہوسکا۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب میں اور ۱۹۷۰ء میں پورے ملک میں جماعت کو بہت بڑی انتخابی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب کی شکست کے نتیجے میں جماعت کی قیادت انتشار کا شکار ہوئی اور رفتہ رفتہ کئی بزرگ علاحدگی اختیار کر گئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ریاستی اقدام قبل از وقت ہے اور جماعت اسلامی کو مسلم لیگ سے نبرد آزمائی کو ترک کر کے نظریات کی اشاعت پر اسی طرح توجہ مرکوز کر دینی چاہیے جیسے وہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۱ء کے دور میں کیا کرتی تھی۔ عملاً جماعت سے علاحدہ ہونے والے بھی تعمیر ریاست اسلامی کی جدوجہد سے لاتعلق ہوگئے۔ یہ بات ان گروہوں، تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے جو منظم ہوئیں، وہ بھی صرف نظریاتی کام کرتی ہیں اور تعمیر ریاست اسلامی کو عملاً ناممکن سمجھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت کو چھوڑنا ایک نہایت نادانش مندانہ فیصلہ تھا اور ان تنظیموں کو جلد از جلد جماعت میں دوبارہ شمولیت اختیار کر لینی چاہیے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے میاں طفیل محمد کی ولولہ انگریز قیادت میں جماعت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء کا پورا دور عوامی جدوجہد کا دور تھا۔ میاں طفیل رحمہ اللہ پرانے احراری تھے اور ان کو شاہ جی نے تاکید کر کے ۱۹۴۲ء میں جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ میاں صاحب سے بڑا انقلابی لیڈر جماعت اسلامی کو کبھی میسر نہ آیا۔ میاں صاحب کی جرأت مندانہ قیادت میں ہم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے عوامی سطح پر سوشل ازم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے اعتبار کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۷۷ء میں میاں صاحب نے پاکستان کی تاریخ میں سب سے کام یاب عوامی انقلابی تحریک تحریک نظام مصطفیٰ امام نورانی اور مفتی محمود کے ساتھ مل کر چلائی۔

لیکن ۱۹۷۷ء سے جماعت کے انحطاط کا دور شروع ہوگیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ احرار کی طرح جماعت بھی اپنی عوامی تحریکات کو انقلابی تنظیمات میں بدلنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ سیکولر نظام زندگی میں اسلامی ریاستی تنظیم کا کوئی تصور جماعت کے پاس موجود تھا نہ احرار کے پاس۔ مولانا مودودی تو مغرب کو جاہلیت خالصہ قرار دینے کے باوجود خلافت کو Theo Democracy (الٰہی جمہوریت) کہتے تھے اور اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' میں سلاطینِ اسلام کو نیم سیکولر اور خلفائے راشدین رحمہم اللہ اجمعین کو جمہوری نمایندہ قرار دیتے تھے۔ مولانا مودودی کی سیاسی فکر لاک اور جیفرسن سے ماخوذ تھی اسلامی ائمہ سیاست امام ابن خلدون، امام ماوردی، امام ابو یعلی، امام یوسف سے نہیں۔ یہ بات واضح طور پر مولانا معین الدین خٹک رحمہ اللہ کی غیر مطبوعہ تنقید خلافت وملوکیت میں بیان کی گئی ہے۔

لہٰذا جماعت اسلامی کی تمام تحریکات ۶۹-۱۹۶۸ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۳ء کا فائدہ فوج اور روایتی سیاست دانوں کو پہنچا جماعت اسلامی کو نہیں۔ یہ ٹھیک ویسا ہی نتیجہ تھا جو احرار کی تحریکوں سے حاصل ہوا تھا۔ تحریک کشمیر، کپور تھلا، شہید گنج، ترک وطن سے فائدہ کانگریس، لیگ، یونی نسٹوں اور کشمیری وکیلوں اور جاگیرداروں کو ہوا، احرار کو نہیں۔ تحریکات ختم نبوت (۱۹۷۴ء، ۱۹۵۳) کے نتیجے میں بھی اسلامی اقتداری نظام قائم نہ ہوسکا اور ان تحریکات کو بھی ریاستی نظام اقتدار اپنے اندر ضم کرنے میں کام یاب ہوگیا۔

اس نوعیت کی تحریکات کو چلا کر احرار اور جماعت کم زور ہوئے ہیں، طاقت ور نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقوق اور سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کی جدوجہد تھیں اور حقوق اور سرمایہ دارانہ عدل کو غلبہ دین کا ذریعہ تصور کرتی تھیں جو کہ ایک بالکل غلط بات ہے۔ سرمایہ دارانہ عدل سے مراد یہ ہے کہ معاشرتی اور ریاستی نظام اس طرح مرتب ہو کہ ہر سٹیزن کو اپنی نفسانی خواہشات کو فروغ دینے کے زیادہ سے زیادہ مساوی موقع ملیں۔

جو نفسانی خواہشات کے مساوی حصول کی جدوجہد پر لبیک کہتا ہے وہ اوصاف حمیدہ تقوا، ورع اور احسان کے فروغ کو اہمیت نہیں دیتا۔ سرمایہ دارانہ عدل کی جستجو کو فروغ روحانیت سے مربوط کرنا ایک ناممکن کام ہے۔ انبیا کرام اور اولیاء اللہ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی۔ اس نوعیت کی جدوجہد کے نتیجے میں تحریکات اسلامی کے اپنے کارکنوں کی للّٰہیت اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روحانیت لازماً منفی طور پر متاثر ہوتی ہے کیوں کہ بہ تدریج ان کی تمام تر توجہ سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ پر مرکوز ہوجاتی ہے بل کہ انفرادی للّٰہیت اور تقوا فروغ سرمایہ دارانہ عدل کی جدوجہد کو غیر موثر اور غیر معتبر بنادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تحریکات اسلامی سرمایہ دارانہ عدل کی جدوجہد منظم کرتی ہیں تو لامحالہ ان میں اہل دین اور متقی علما پس پشت کردیے جاتے ہیں اور ان مہمات میں چالاک، دنیا دار پروفیشنلز اور ماڈرن عناصر نمایاں بن جاتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی بھی اتنے چالاک، دنیا دار اور ماڈرن نہیں بن پاتے جتنے عمران خان اور الطاف حسین کے کارکن کیوں کہ ہمارے پروفیشنلز کا حال یہ ہے کہ ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

جب عمران خان اور الطاف حسین یہ کہتے ہیں کہ وہ سرمایہ دارانہ عدل قائم کریں گے تو عوام ان پر یقین کرلیتے ہیں کیوں کہ عمران خان اور الطاف حسین مخلص لبرل اور قوم پرست ہیں، اور سرمایہ دارانہ اہداف آزادی اور ترقی کے فروغ کے لیے ہر اسلامی حکم کو پس پشت ڈالنے پر کمر بستہ ہیں۔ جب پروفیسر خورشید احمد اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کا دعوا کرتے ہیں تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پروفیسر خورشید اور خواجہ صاحب سرمایہ داری سے کیسے مخلص ہوسکتے ہیں؟ یہ ہیں تو آخر کار مولوی، یہ تو سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ کو تحفظ دین اور غلبہ دین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مقصد اعلا نہیں، ان کو موقع دیا گیا تو یہ تو سرمایہ دارانہ حقوق کو کسی نہ کسی حد تک احکام شرع سے محدود ضرور کردیں گے۔ لہٰذا ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں عوام عمران خان کو اسّی لاکھ ووٹ دیتے ہیں اور جماعت اسلامی کو نو لاکھ حال آں کہ دونوں کا منشور یک ساں ہے۔

جیسے جیسے سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی اسلامی جماعتوں کی جدوجہد سیکولر قوتوں کو مضبوط کرتی ہیں ویسے ویسے تحریکات اسلامی کے کارکنان مایوسی کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی ہمتیں پست ہوجاتی ہیں اور یہ تحریکیں اپنی اسٹریٹ پاور کھو دیتی ہیں۔ اسی اسٹریٹ پاور کی بنیاد پر سیکولر قوتیں ہمارے ساتھ سرمایہ دارانہ ریاستی اقتدار تقسیم کرنے پر راضی ہوتی ہیں۔ احرار نے یہ اسٹریٹ پاور ۴۴-۱۹۴۳ء تک کھو دی تھی لہٰذا کاروباری احراریوں کی ان تھک کوشش کے باوجود یونی نسٹ پارٹی تک ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں اشتراک عمل پر راضی نہ ہوئی، گو کہ اس انتخابات میں احرار نے شاہ جی کی خفگی کے باجود کئی Electables کھڑے کیے تھے۔ ہم اپنی اسٹریٹ پاور ۹۰-۱۹۸۹ء تک کھو چکے تھے لہٰذا اس کے بعد سے کسی سیکولر جماعت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے ہمارے ساتھ اشتراک عمل نہیں کیا اور ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں عمران خان اور نواز شریف نے ہماری سیٹ ایڈجسٹمنٹ کی التجاؤں کو یک سر ٹھکرا دیا جس کی انھیں کوئی قیمت نہ دینی پڑی۔ دونوں بھاری اکثریت سے کام یاب ہوئے۔

تحریک احرار کی طرح جماعت اسلامی نے بھی اپنی عوامی شناخت برقرار رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر رفاہِ عامہ کا کام کیا ہے اور اس ضمن میں جماعت اسلامی کا کام زیادہ منظم اور مستحکم ہے لیکن دونوں جماعتوں نے اپنے رفاہی اقدامات کو فروغِ دعوت اور تعمیر اسلامی نظام اقتدار کی جدوجہد سے مربوط نہ کیا۔ جماعت اسلامی نے اپنے معاشرتی عمل کو وسیع کرنے کے لیے برادر تنظیموں کا ایک وسیع جال بھی قائم کیا ہے لیکن چوں کہ اقتداری ادارتی صف بندی اس پروفیشنل اور رفاہِ عامہ کے کام کو Contextualise نہیں کرتی لہٰذا اس کا مجموعی اثر ہماری نظریاتی شناخت پر منتج نہیں ہے۔ انھی سوشل اور پروفیشنل ادارتی وسیلوں سے شعبہ جاتی ماہرین مثلاً الطاف گوہر، اے کے بروہی، مراد علی شاہ اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے جماعت اسلامی کے پالیسی سازی کے عمل میں دخول حاصل کرلیا ہے اور جماعت کی Policy discourse کو سیکولرائز کر رہے ہیں۔ جماعت کے سابقین مثلاً ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر عشرت حسین اور ڈاکٹر وقار مسعود بھی کسی نہ کسی حد تک یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

جماعت اسلامی کی سب سے پہلی اور سب سے بااثر برادر تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ یہ جماعت اسلامی کی فکر اور اس کی قیادت پر پوری طرح چھا گئی ہے اور اس نے علما کو جماعت کی پالیسی سازی کے عمل سے تقریباً بالکل بے دخل کر دیا ہے۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابی منشور کی کمیٹی کے اٹھارہ ارکان میں سے صرف ایک عالم دین تھے باقی جماعت کے بیوروکریٹ تھے حال آں کہ ضلعی سطح (شہری سطح پر نہیں) پر بھی امرائے جماعت علما ہی ہیں۔ اسلامی جمعیت جو کہ بنیادی طور پر سائنٹسٹ، اکاؤنٹنٹ، انجینئرز، ڈاکٹرز اور مینجمنٹ اسپیشلسٹ پیدا کرتی ہے جو پیشہ وارانہ ماہرین ہوتے ہیں اور ان کا فطری میلان ماڈرنسٹ ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی کا بیرونِ ملک کام امریکا، برطانیہ اور سعودی عرب میں مقامی نہیں بل کہ پاکستان کے تارکینِ وطن چلا رہے ہیں اور اس کام پر سعودی عرب کی چھاپ ہے۔ اس کام کا مقصد ان ممالک میں ایک ایسی مسلمان لابی تیار کرنا ہے جو وہاں کے رائج شدہ سیاسی نظام میں اپنا اثر بڑھا سکے اور مسلمان ممالک بالخصوص سعودی عرب اور پاکستان کے قومی مفاد کو فروغ دے سکے۔ یہ کام سیکولر جماعتیں بالخصوص ایم کیو ایم، پیپلز پارٹی، اور تحریک انصاف بھی منظم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طور پر کر رہی ہیں۔ جب رائج شدہ نظام میں دخول اپنا مقصد ٹھہرا تو نظاماتی تنقید کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو پڑھے لکھے نوجوان پاکستان، امریکا اور برطانیہ میں جماعت سے وابستہ ہوتے ہیں وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ماڈرن ازم ایک متروک اور فرسودہ نظریہ ہے جس کی نامعقولیت علمی طور پر دو اور دو چار کی طرح ثابت کی جا چکی ہے۔ یہ ماڈرنسٹ جماعت اسلامی کو ایک سیکولر جماعت بنا رہے ہیں اور جیسے جیسے جماعت اسلامی ماڈرنائز ہو رہی ہے وہ مولانا مودودی کے دو بنیادی اجتہادات، اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے، سے عملاً رجوع کرنے پر مجبور ہے۔

جماعت اسلامی کے احیا کو کیسے ممکن بنایا جائے؟

ماڈرنسٹ جماعت اسلامی کو اسی طرح تباہ کر رہے ہیں جس طرح فرقہ پرستوں نے تحریک احرار کو تباہ کیا۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی کے وسط تک تحریک احرار مسلمانانِ پنجاب کی سب سے اہم بین المسلکی جماعت تھی جس کو دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علما کی تائید حاصل تھی اور معروف شیعہ عالم مولانا مظہر علی اظہر کئی بار احرار کے صدر رہ چکے تھے اور ۳۹-۱۹۳۸ء کی شیعہ سنی اتحاد کی لکھنؤ کی تحریک کے قائد تھے۔ اس تحریک کی تائید مولانا حسین احمد مدنی بھی فرما رہے تھے اور اس وقت کسی دیوبندی عالم نے شیعت کی تکفیر کا فتوا نہیں دیا تھا۔ لیکن اب احرار کے قائدین امام خمینی کو دو ٹانگوں والا وحشی جانور برملا کہتے ہیں اور تحریک احرار ایک نکاتی پریشر گروپ میں تبدیل ہو گئی ہے جو جنوبی پنجاب کے چند خاندانوں اور ان کے لواحقین تک محدود ہے۔

جماعت اسلامی کو اس المیے سے بچنا ہے تو اس کو اپنی تاریخ کی قید سے نکلنا ہوگا ورنہ ماڈرنس ازم اس کو ویسے ہی کھا جائے گی جیسے فرقہ واریت تحریک احرار کو ہضم کر گئی۔ جماعت اسلامی کی نظریاتی آدرشیں اور اس کا دستور دونوں منجمد ہو کر رہ گئے ہیں اور تاریخ نے ان کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اگر یہ نظریاتی اور دستوری انجماد قائم رہا تو جماعت اسلامی بھی تحریک انصاف یا مسلم لیگ کا ایک پریشر گروپ بن جائے گی اور اس کی فعالیت اس کی رفاہِ عامہ کا کام کرنے والی برادر تنظیموں تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

ماڈرن ازم کو دو اقدامات سے رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں اقدامات طویل المدت جدوجہد کے متقاضی ہیں لیکن ان کے بغیر جماعت اسلامی لازماً ایک پریشر گروپ کا رول اختیار کر لے گی جو یا تو کسی سیکولر جماعت میں سمو جائے گی یا نظام اقتدار کی تشکیلی جدوجہد سے بے دخل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوجائے گی۔ یہی تحریک احرار کے ساتھ ہوا۔ اس میں شامل سیاسی عناصر مسلم لیگ اور عوامی لیگ میں چلے گئے اور اس کے غیر سیاسی کارکن تحریک ختم نبوت کا ایک فیکشن بن گئے۔ وہی مولانا مظہر علی اظہر جنھوں نے جناح صاحب کو ''کافر اعظم'' کہا تھا مسلم لیگ کے قائد بن گئے۔ ظفر علی خان بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانگریس میں شامل ہوگئے، نصر اللہ خان عوامی لیگی بن گئے۔ اب احرار کی قیادت محض شاہ جی کے بیٹوں پر مشتمل ہے۔

پہلا قدم جو جماعت اسلامی کو اس نوعیت کی خودکشی سے بچا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جماعت ایک Democratic Centralist Vanguard Party کا تنظیمی ڈھانچہ ترک کر دے۔ یہ تنظیمی ڈھانچہ مولانا مودودی نے کمیونسٹ پارٹی سے لیا، اس کی کوئی نظیر اسلامی تاریخی جماعت سازی میں نہیں ملتی۔ اس نہج پر مجاہدین کی جماعتیں کبھی منظم کی گئیں نہ صوفیا کی جماعتیں۔ یہ جماعتی انتظامی ڈھانچہ چین کے علاوہ پوری دنیا میں ناکام ثابت ہوا اور ہر جگہ لبرل ازم نے اسے تہس نہس کر دیا۔ جماعت اس بات کا ادراک کرے کہ وہ ملک کی متعدد اسلامی تحریکات میں سے محض ایک تحریک ہے اور اس کو کسی دوسری تحریک پر کسی نوعیت کی کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ یقیناً احیائے دین کی جدوجہد میں جماعت اسلامی کی ایک مخصوص ذمہ داری ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ملک کی تمام دفاعی اور اقدامی تحریکات اسلامی کی رابطہ کی جماعت ہے اور اس کے نظریات:

۱۔ اسلام ایک مکمل خودکفیل نظام حیات ہے۔

۲۔ مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

وہ ناگزیر مفروضاتی تناظر فراہم کرتے ہیں جس کی بنیاد پر تحفظ دین اور غلبہ دین کی ہمہ جہت جدوجہد کو اس طرح مرتب کیا جاسکتا ہے کہ پاکستانی انفرادیت، معاشرت اور نظام اقتدار پر اسلامی Hegemony قائم ہوجائے۔

اگر جماعت کو تحریکات اسلامی کی رابطہ کی جماعت بننا ہے تو لازماً اس کا بنیادی مخاطب دوسری تحریکات کی قیادت اور کارکنان ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس بنیادی Constituency کی تعداد فی الحال تقریباً دو کروڑ ہے۔ اس بنیادی Constituency کو یقین دلانا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے اور ضرورت ہے کہ جو کام مختلف دفاعی اور اقدامی تحریکات اسلامی کر رہی ہیں اس کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ اسلامی انفرادی، معاشرتی اور اقتداری Hegemony قائم ہو، اس ہدف کو حاصل کرنے کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے ایک طویل المدت کارکنانی مکالمے کی ادارتی صف بندی کی ضرورت ہے جو تمام تحریکات اسلامی کے کارکنوں کے لیے ممکن بنادے کہ وہ جماعت اسلامی کی حکمت عملی کی تشکیل اور تنفیذ میں حصہ لے سکیں اور عملاً اس بات کا شعور حاصل کریں کہ بہ حیثیت ایک رابطہ کی جماعت، جماعت اسلامی محض اس کے اپنے ارکان و کارکنوں کی جماعت نہیں، وہ ہر مدرسہ، ہر خانقاہ کے کارکن، تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، سپاہ صحابہ اور تمام مجاہد تنظیموں کے تمام کارکنوں کی جماعت ہے۔

کہو ہر ہر کارکن سے سب جتھوں کو اپنا گھر سمجھو
ہر ایک بھائی کو تم اپنا حلیف و ہم سفر سمجھو

جماعت کی تنظیم میں وہ گنجایش پیدا کرنا ناگزیر ہے جو اس کو تحریکات اسلامی کی رابطہ جماعت بنادے اور ہر تحریک کا کارکن اس کو اپنی جماعت کا لازمی لاحقہ سمجھنے لگے۔ انقلابی Mass پارٹیاں ایسے ہی بنتی ہیں۔ جماعت کو ایک Mass انقلابی پارٹی بنانا لازماً ایک طویل المدت اور مشکل ترین عمل ثابت ہوگا جس میں کئی تشکیلی تجربات ناکام ثابت ہوں گے اور کئی محاذوں پر شکست اٹھانا پڑے گی لیکن اس عمل کی ابتدا کیے بغیر ہم اپنی تاریخ کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتے اور جماعت کا حشر، احرار سے مختلف نہیں ہوسکتا۔

دوسری چیز ضروری عوامی اقتداری صف بندی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام سے باہر کوئی جگہ موجود نہیں اور انہدام نظام لازماً سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ کے تناظر میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کے اندر سے ایسے اقتداری محور Node منظم کرنا ہیں جہاں سرمایہ دارانہ اقتداری محور سے قوت منتقل ہوسکے سرمایہ دارانہ اقتداری Nodes میں پولیس، سول انتظامیہ عدالتیں کارپوریشن، مالیاتی ادارے یعنی سود اور سٹہ کے بازار شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ مقننہ انھی اداروں کی قیدی ان معنوں میں ہوتی ہے کہ وہ وہی قوانین بناسکتی ہے جن کی تنفیذ یہی مستقل سرمایہ دارانہ اقتداری Nodes کرسکیں سرمایہ دارانہ اقتدار کی گرفت سے چھٹکارا جبھی مل سکتا ہے جب معاشرے میں ایسے متبادل اقتداری ادارے موجود ہوں جہاں سرمایہ دارانہ مخالف قوت منظم اور مرتب کی جاسکے۔

ایک اسلامی معاشرے میں یہ انقلابی Nodes فطرتاً مسجد کو بنایا جاسکتا ہے۔ محلّہ، بازار، تعلقہ، ضلع، دیہات اور شہر کی سطح پر ایسے بین المسالک وفاق المسجد قائم کیے جاسکتے ہیں جن میں قضا اور افتا کی فراہمی کا ہمہ گیر انتظام ہو اور جو اپنے فیصلوں کو محلّہ اور بازار کی سطح پر نافذ کرنے کی صلاحیت بہ تدریج جمع کریں۔ یہی سرمایہ دارانہ تردیدی نظام اقتدار کا وہ Neuclus ثابت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں اور ہر سطح پر سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں پولیس، ٹیکس اور رجسٹریشن کے دفاتر، عدالتیں، کاروباری فرمیں، دکانیں، اخبارات اور ٹیلی وژن اسٹیشن وغیرہ ان بین المسالکی وفاق المساجد کی ماتحتی پر بہ تدریج مجبور ہوتے چلے جائیں۔ یہ کام ایران میں ۱۹۰۸ء سے آیت اللہ طبطبائی رحمتہ اللہ نے محلے کی سطح پر شروع کیا اور ۱۹۷۸ء تک پورے معاشرے کی تنظیمی صلاحیت اسلامی ریاستی اقتداری اداروں کی گرفت میں آگئی۔ ایسا ہی نظام اقتدار مجاہدین حزب اللہ نے جنوبی لبنان میں قائم کیا ہے۔

اس قسم کی معاشرتی ادارتی صف بندی کی تنظیم اور تنفیذ کی ہر دوسری اسلامی جماعت کے مقابلے میں جماعت اسلامی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی ایک کلامی جماعت ہے۔ فقہی جماعت نہیں ہے۔ بین المسالک اتحاد اور اشتراک العمل کو فروغ دینے کی اس جیسی Credibility کسی دوسری جماعت کی نہیں۔ یہ بات ملی یک جہتی کونسل کے تجربات سے واضح ہوگئی ہے۔ جماعت کا مقامی انتظامی ڈھانچہ بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اور مضبوط ہے۔ محترم سید اسد گیلانی فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم اسلامی تحریک کا Iron Cage ہیں۔''

سیکولر جماعتوں بالخصوص ایم کیو ایم نے اس انتظامی ڈھانچے کو Replicate کر کے اپنی مقامی معاشرتی گرفت کو مضبوط کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ اگر جماعت چاہے تو وہ ملک بھر میں کئی سطحوں پر بین المسالک وفاق المساجد قائم کر سکتی ہے۔ یہ اس کے تمام تحریکات اسلامی کے رابطہ کی جماعت ہونے کا عملی ثبوت ہوگا۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

۲۰۱۳ء کے انتخابی نتائج اور تحفظ دین اور غلبہ دین کی جدو جہد

اس مضمون میں کوشش کروں گا کہ ایک ایسی حکمت عملی کی نشان دہی کروں جسے اپنا کر ہم تحفظ دین اور غلبہ دین کی جدو جہد کو آگے بڑھا سکیں۔

انتخابی نتائج کا تجزیہ

پہلے جدول میں ان انتخابات میں اسلامی جماعتوں کی کارکردگی کا اجمالی خاکہ مرتب کیا گیا ہے۔

اسلامی جماعتوں کے انتخابی نتائج ۲۰۱۳ء [لاکھوں میں]

اسلامی جماعتیں	قومی اسمبلی		بلوچستان اسمبلی		پختون خوا اسمبلی		پنجاب اسمبلی		سندھ اسمبلی	
	تعداد	فی صد	تعداد	فی صد	تعداد	فی صد	تعداد	فی صد	تعداد	فی صد
جمعیت علمائے اسلام (ف)	۱۴٫۶۱	۳٫۲۲	۲٫۷	۱۵٫۸	۷٫۳۳	۱۳٫۶	۱٫۵۳	۰٫۵۴	۱٫۰۴	۱٫۱۱
جماعت اسلامی	۹٫۶۳	۲٫۱۰	۰٫۰۰۳	۰٫۰۲	۴٫۰۴	۷٫۵	۴٫۸۸	۱٫۷۵	۱٫۳۱	۱٫۱۳
متحدہ دینی محاذ	۳٫۶۰	۰٫۸۰	۰٫۱۷	۱٫۳۰	۰٫۳۸	۰٫۷	۱٫۳۴	۰٫۴۸	۱٫۱۷	۱٫۱۲
دیگر اسلامی جماعتیں	۳٫۵۰	۰٫۱۷	۰٫۵۶	۷٫۳۷	۰٫۲۷	۰٫۵	۱٫۸۴	۰٫۶۶	۰٫۵۹	۰٫۵۷
کل	۳۱٫۳۴	۶٫۸۹	۲٫۸۰	۲۴٫۴	۱۲٫۰۳	۲۲٫۳	۹٫۵۹	۳٫۴۳	۴٫۱۱	۳٫۹۳

اس تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ جن لوگوں نے ہمیں صوبائی اسمبلیوں کے لیے ووٹ دیے انھوں نے ہی ہمیں قومی اسمبلیوں کے لیے بھی ووٹ دیے تو ہمارے ووٹروں کی تعداد ساڑھے بتیس لاکھ بنتی ہے جو مجموعی ووٹروں کی تعداد کا سات فی صد ہے۔

۲۔ ہمارے قومی اسمبلی کے مجموعی ووٹوں کے مقابلے میں ہمارے صوبائی اسمبلیوں کے لیے حاصل شدہ ووٹ تقریباً بانوے فی صد ہیں (تقریباً ۲۹ لاکھ)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ہمیں ووٹ دیے انھوں نے اسلامی عصبیت کی بنیاد پر ہمارا ساتھ دیا۔ اگر وہ اپنے اغراض اور حقوق طلبی کی کی بنیاد پر ووٹ دیتے تو قومی اور صوبائی ووٹنگ کا رویہ مختلف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتا۔صوبائی سطح پر بالخصوص ایسے افراد کو ووٹ دیا جاتا ہے جو لوگوں کے مقامی کام کرا سکیں۔ لیکن ہمارے ووٹروں نے اس نوعیت کی خودغرضی کا مظاہرہ نہیں کیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے ووٹروں میں بتیس لاکھ افراد ایسے موجود ہیں جو اسلامی عصبیت کی بنیاد پر (خودغرضی کی بنیاد پر نہیں) سیاسی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔یہی بتیس لاکھ اور ان کے لواحقین ہمارا بنیادی حلقہ اثر (Constituency) ہے اور چوں کہ ہم نے اپنے اس حلقہ اثر کو سیاسی طور پر منظم اور طاقت ور بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی لہٰذا ہم ملک کے نظام اقتدار (ریاست) میں اجنبی بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارا حلقہ اثر بتیس لاکھ سے کہیں زیادہ ہے۔اگر اوسط ٹرن آؤٹ باون فی صد تصور کیا جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ جنھوں نے ووٹ نہیں دیا ان میں سے کم از کم دس فی صد افراد اسلامی عصبیت کے حامل ہیں تو ہمارا بنیادی حلقہ اثر تقریباً انہتر لاکھ بنتا ہے یہ ایک عظیم نظریاتی حلقہ اثر ہے جس کو آپس میں اشتراک، فعال اور منظم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔صوبائی سطح پر ہمیں سب سے زیادہ ووٹ پختون خوا میں ملے (۱۲لاکھ)۔اس صوبے میں اور بلوچستان میں بائیس فی صد سے زیادہ ووٹ ملے اور بلوچستان میں ہمارے ووٹ مسلم لیگ (ن)، تحریک انصاف اور پیپلز پارٹی کے مجموعی ووٹوں سے کہیں زیادہ تھے۔ بلوچستان میں ہمارے ووٹ بلوچ اور پختون قوم پرست جماعتوں کے مشترکہ ووٹ سے کہیں زیادہ تھے۔بلوچستان کی سب سے بڑی جماعت جمعیت علمائے اسلام ثابت ہوئی اور ہماری اس جماعت کو تقریباً اتنے ہی ووٹ ملے جتنے تمام پختونوں اور بلوچ قوم پرست جماعتوں کو ملا کر ملے۔ہم بلوچستان میں قوم پرستوں سے بڑی سیاسی قوت بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پختون خوا میں ہم بلاشبہ سب سے بڑی عوامی قوت ہیں۔

۴۔پنجاب اور سندھ میں ہماری کوئی عوامی حیثیت نہیں ان دونوں صوبوں میں ہمیں دو فی صد سے بھی کم ووٹ ملے۔ان صوبوں میں ہماری سب سے موثر جماعت جمعیت علمائے پاکستان ہوا کرتی تھی۔۲۰۱۳ء کے انتخاب میں اس کو سندھ میں اعشاریہ دو فی صد اور پنجاب میں اعشاریہ ایک فی صد ووٹ ملے۔حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں بریلویت کے انحطاط نے ہمیں کھوکھلا کر دیا ہے اور ہماری روایتی عوامی صف بندی کو پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نگل گئی ہے۔سندھ اور پنجاب میں اسلامی جدوجہد کا فروغ اور بریلویت کا فروغ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔سندھ اور پنجاب میں ہمیں جو چیلنج درپیش ہیں وہ مختلف النوع ہیں اور اس بارے میں ذیل میں چند معروضات پیش کروں گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہماری سب سے بڑی اور سب سے کام یاب جماعت جمعیت علمائے اسلام ہے۔ ہماری اس جماعت نے تقریباً پندرہ لاکھ ووٹ قومی اسمبلی اور تیرہ لاکھ ووٹ صوبائی اسمبلیوں میں حاصل کیے۔قومی اسمبلی میں اس کی پندرہ نشستیں ہیں ۔اس کا ووٹ بینک محفوظ اور مولانا فضل الرحمٰن ایک بردبار، زیرک اور فہیم قائد ہیں۔آپ نے جو انتخابی حکمت عملی وضع کی وہ سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ اور موثر ثابت ہوئی۔ صرف انھی نشستوں پر امیدوار کھڑے کیے جہاں کام یابی کی توقع تھی۔ اس جماعت کی پنجاب کی ناقص کارکردگی پریشان کن ہے۔ چوں کہ جمعیت علمائے اسلام ہماری سب سے کام یاب جماعت ہے لہٰذا سیکولر دشمن اس کو ملعون اور مطعون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

ہماری دوسری بڑی جماعت، جماعت اسلامی ہے۔۲۰۱۳ء کے انتخاب میں اس کو دو فی صد ووٹ ملے اور صرف پختون خوا میں اس کی کارکردگی قابل ذکر ہے جہاں اس کو چار لاکھ ووٹ ملے ۔پنجاب میں جماعت اسلامی کو مجموعی ووٹوں کے صرف دو فی صد حاصل ہوئے اور سندھ میں صرف ایک فی صد۔ سندھ میں کراچی اور حیدرآباد کے بائیکاٹ کا اثر پڑا لیکن یہ بائیکاٹ نہ بھی ہوتا تو جماعت اسلامی کے مجموعی ووٹ دُگنے سے زیادہ نہیں ہوسکتے تھے یعنی مجموعی ووٹوں کے دو فی صد۔۱۹۷۷ء سے جماعت اسلامی روبہ تنزل ہے اور اس کی قیادت اس تنزل کا سبب خارجی عوامل کو گردانتی ہے جدیدیت اور ماڈرن ازم کے غلبہ کو نہیں۔حال آں کہ جماعت میں جدیدیت اور ماڈرن ازم کے غلبے نے جماعت کے وجود کو سخت خطرے میں ڈال دیا ہے۔

متحدہ دینی محاذ کی کارکردگی بالخصوص سندھ میں حوصلہ افزا ہے جہاں اس کو جمعیت علمائے اسلام سے زیادہ اور جماعت اسلامی کے تقریباً برابر ووٹ ملے۔سندھ میں ہماری اس جماعت کا مقابلہ سیکولر دہریوں سے تھا۔اس کے برعکس پنجاب میں یہ فرقہ واریت سے دور نہ ہوسکی۔ دوسری فرقہ نواز جماعتوں مجلس وحدت المسلمین (یہ ایک شیعہ جماعت ہے) سنی اتحاد کونسل اور پاکستان سنی تحریک کے برعکس وہ فرقہ واریت سے برأت کرتے ہوئے اس سے دور رہے۔فرقہ وارانہ جماعتوں کو قومی اسمبلی کے مجموعی ووٹوں کا اعشاریہ دو فی صد حاصل ہوا۔اس میں متحدہ دینی محاذ کے ووٹ شامل نہیں جو اصلاً کوئی فرقہ نواز جماعت نہیں بل کہ متحدہ مجلس عمل کی جانشین جماعت ہے۔

ع ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اب میں اسلامی حکمت عملی کے ضمن میں چند گزارشات پیش کروں گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انتخابی عمل اور سرمایہ دارانہ نظام

انتخابی عمل کے بارے میں ماہنامہ سنابل مئی ۲۰۱۳ء میں جو رویہ اختیار کیا گیا وہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نا قابل عمل اور نظری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن علما کی تحریرات سے سنابل نے انتخابات کے مضمرات بیان کیے ان میں سے کئی مثلاً مولانا سلیم اللہ خان اور مولانا تقی عثمانی نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں اسلامی جماعتوں کی تائید فرمائی اور ان جماعتوں میں اشتراک عملی کی ضرورت پر زور دیا۔ ہماری سب سے بڑی جماعت جمعیت علمائے اسلام ۱۹۷۰ء سے مستقل انتخابات میں حصہ لے رہی ہے۔ یہ جماعت جمعیت علمائے ہند کی جانشین جماعت ہے اور اس کو پاکستان اور ہندستان کے جمہورِ علمائے دیوبند کی تائید حاصل ہے۔

یہ درست ہے کہ انتخابات کے ذریعے مقاصدِ شریعت حاصل نہیں ہوتے لیکن الیکشن میں احکاماتِ شریعہ کی پابندی کرتے ہوئے حصہ لینا جائز ہے۔ اسی طرح یقیناً ووٹ شہادت ہے نہ بیعت، لیکن یہ عمل جائز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم الیکشن میں حصہ لینے پر مجبور ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ترتیب اقتدار کے تعین میں انتخابات ایک معروف ذریعہ ہیں اور ہم ابھی تک اس بات کی استطاعت مہیا نہیں کر سکے کہ سرمایہ دارنہ نظام اقتدار کو اس کے باہر سے متزلزل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ کیا تبلیغی جماعت اپنے اجتماعات کے لیے پولیس سے اجازت نہیں لیتی؟ کیا تنظیم اسلامی کے ارکان ٹیکس نہیں دیتے؟ کیا ''سنابل'' رجسٹرڈ نہیں؟ اگر ہم سرمایہ دارانہ نظامِ قانون کی پابندی قبول کرتے ہوئے اس عمل میں شرکت سے انکار کرتے ہیں جن سے اس قانونی نظام کو ترویج اور تبدیل کیا جاتا ہے (یعنی الیکشن) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سرمایہ داری کی اطاعت کو قبول کرتے ہیں، کہتے کچھ بھی رہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ سرمایہ داری ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس کی تسخیر اس کے اندر ہی سے ممکن ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ہمیں سرمایہ داری کی تسخیر کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی اسلام کاری کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو مستحکم نہیں کرنا چاہیے لیکن اس نظام زندگی کی تسخیر اس کے اپنے دیے ہوئے وسائل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انتخابات بھی ایک ایسا وسیلہ ہیں جن کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کو مسخر کیا جا سکتا ہے اور ہمیں انتخابی عمل کو اسی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ وہ دوسرے ذرائع جو سرمایہ دارانہ نظام کی تسخیر کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں ان میں فنانشل مارکیٹ، ٹیکنالوجی، ٹریڈ یونین آرگنائزیشن اور اسلحہ شامل ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تحفظ دین کی جدوجہد میں علمائے دیوبند اور علمائے بریلوی نے یہی حکمت عملی اپنائی تھی اور جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان اسی حکمت عملی پر کاربند ہیں۔ انھوں نے پارلیمانی اور انتخابی نظام میں شمولیت اسلامی نظام تعلیم، مساجد اور مدارس کو سرمایہ دارانہ ریاستی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی اختیار کی اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی حد تک کام یاب رہے ہیں۔ اگر جمعیت علمائے اسلام مرکزی حکومت میں شامل ہوئی تو وہ اسلامی نظام تعلیم کو تحفظ و تقویت پہنچائے گی اور اس نظام تعلیم کی استعماری تسخیر کو ناممکن بنا دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری حلیف اور سیکولر ماڈرنسٹ جمعیت علمائے اسلام کی کردار کشی اور اس کی عملی بے راہ روی کا پروپیگنڈا تسلسل کے ساتھ کئی عشروں سے کر رہے ہیں اور ان کی تمنا ہے کہ جماعت اسلامی کو جمعیت علمائے اسلام کے خلاف لا کھڑا کر کے اتحاد اسلامی کو پارہ پارہ کر دیں۔

اسلامی معاشرت کے دفاع کا جو کردار جمعیت علمائے اسلام ادا کر رہی ہے اس کے لیے اس کو ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اس کو Electables کو اپنی صفوں میں شامل کرنا پڑا ہے جن کا کردار مشکوک ہے اور اس کی پالیسی سازی کے عمل میں علما کرام کا اشتراک کم ہو گیا ہے۔ یہ عمل جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے ہند اور ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تحریک احرار کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کی قیادت نے اس عمل کا سدباب کرنے میں کوتاہی کی ہے لیکن اس عمل کے منفی اثرات کے فروغ کا اصل محرک اسلامی اقتداری صف بندی کی کم زوری ہے۔

اقتداری ادارتی صف بندی

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ہمارا فطری حلقہ اثر تقریباً دو کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ ہم ملک کی سب سے بڑی Potential طاقت ور لیکن سب سے غیر منظم انقلابی قوت ہیں اور جب ہم Mass کی سطح پر منظم ہو جائیں گے تو کوئی سرمایہ دارانہ نظریاتی حریف ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس Mass constituency کی اقتداری ادارتی صف بندی کوئی مشکل کام نہیں۔ فرانس کے ڈیبرے اور گنوشے نے کئی تحقیقات میں ثابت کیا ہے کہ عوام کو ان کی مذہبی شناخت کی بنیاد پر منظم اور متحرک کرنا، حقوق اور اغراض کی بنیاد پر منظم اور متحرک کرنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ بہ شرط کہ مذہبی شناخت کا عوامی ادراک ثقافتی اور رسومی اظہار کے ذریعے استوار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا جائے معروضی اور کلامی مباحث کی بنیاد پر نہیں۔ ہمارے ملک میں مذہبی روایات اور رسوم کا وسیع اثر موجود ہے اور خاندانی و برادری تنظیم معاشرت اس مذہبی لگاؤ اور شناخت کو فروغ دینے کا فطری ذریعہ ہیں۔ اگر ہم ایک مربوط معاشرتی حکمت عملی کے ذریعے مذہبی عصبیت کو برادری کی عصبیت سے ہم آہنگ کر دیں تو شہری اور دیہی سطح پر ایسا عوامی نظام اقتدار ابھر سکتا ہے جہاں قوت کا سرچشمہ مسجد ہو اور امام مسجد واحد جائز عوامی نمایندہ کا کردار ادا کر سکتا ہو۔ اس ثقافتی/رسومی پیش رفت کی بنیاد پر ہم مساجد کا علاقائی اقتدار قائم کر سکتے ہیں اور مسجد میں بنیاد رکھنے والے نظام افتا اور قضا کی بنیاد پر محلہ اور بازار کی سطح پر احکام کی تنفیذ ممکن بنا سکتے ہیں۔

اس بین المساجد نظام اقتدار میں ہم اپنے معاشی اور رفاہِ عامہ کے کام کو سمو سکتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اداروں، بیوروکریسی، عدلیہ، پارلیمنٹ اور میڈیا کی قوت کو اسلامی اقتداری اداروں، مساجد، مدارس، خانقاہوں، برادریوں کے اجتماعات وغیرہ کی طرف منتقل کرنے کی جدوجہد منظم کی جاسکتی ہے۔ یوں ہماری دفاعی ریاستی حکمت عملی جو ابھی تک صرف مذہبی مراکز کی حفاظت پر مرکوز ہے ایک اقدامی حکمت عملی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اور ہم الیکشن میں حصہ لے کر اسلامی اداروں کی عوامی قوت نافذہ میں اضافہ کے لیے سیاسی وسائل فراہم کر سکتے ہیں۔ جب تک ہمارے پاس ایسے عوامی ریاستی ادارے موجود نہیں جہاں سرمایہ دارانہ اداروں سے قوت منتقل کی جاسکے ہم ایک دفاعی اسلامی حکمت عملی کو اپنانے پر مجبور رہیں گے اور انتخابی عمل کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے انہدام کے لیے استعمال نہ کر سکیں گے۔

مشکلات

میرے خیال میں یہ ایک آسان کام ہے۔ ڈیبرے لکھتا ہے کہ اسی حکمت عملی پر بولیویا میں چی گویرا کی تحریک کو شکست دی گئی اور یہاں کا کیتھولک چرچ ہی اس حکمت عملی کی تنفیذ کا ذمہ دار تھا۔ لیکن اس راہ میں تین اہم رکاوٹیں حائل ہیں۔ اب میں ان کا تذکرہ کروں گا۔

بریلویت کا زوال

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قوتوں کی عوامی اجنبیت اور کمزوری کا بنیادی سبب برصغیر کی اسلامی تاریخی روایات سے دوری ہے۔ ان روایات، رسوم و رواج اور معاشرت کا اصل سرچشمہ بریلوی اور قادری مکاتیب فکر ہیں۔ بریلویت نے جہاد ١٨٥٧ء کے بعد سے انگریزی نظام اقتدار کے سامنے مکمل شکست قبول کر لی اور اس کا اظہار دو طریقوں سے ہوا۔ اکابر بریلوی مشائخ بالخصوص سندھ اور پنجاب میں انگریز استعماری نظام اقتدار سے منسلک ہو کر اس کے آلہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کار ہو گئے ۔دوسری طرف بریلوی مکاتب فکر نے اپنے سیاسی وجود کو مسلم لیگ میں کلیتاً سمو دیا اور جناح صاحب سے بڑھ کر مسلم قوم پرستی کے وکیل بن گئے ۔ بریلوی حلقوں میں نظریاتی تکفیر کی وبا پھوٹ پڑی اور جدوجہد کا ہدف انگریزی استعمار یا ہندستانی قوم پرستی نہیں بل کہ دیوبند اور صادق پور بن گیا۔اس کے اتنے گہرے منفی اثرات مرتب ہوئے کہ بریلویوں کے سوادِ اعظم نے امام نورانی جیسے درویش کی ایک نہ سنی ۔امام نورانی تمام مسلمانوں کے متفقہ رہ بر تھے سوائے بریلویوں کے۔امام نورانی کی رحلت ایم ایم اے کی کج روی اور انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے۔بریلویوں کی نمایندہ جماعت جمعیت علمائے پاکستان کو ساڑھے چار کروڑ میں سے صرف ستر ہزار ووٹ ملے جب کہ کم از کم ساڑھے تین کروڑ ووٹر بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔آج مولانا احمد اللہ شاہ،مولانا فضل حق خیر آبادی،جنرل بخت خان، پیر صاحب مانکی شریف، پیر صبغت اللہ اور امیر ملت پیر جماعت علی شاہ کے پیرو غلبہ دین کی جدوجہد سے بالکل لاتعلق ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید سنی اسلامی تحریکات کے ہراول دستے برسرپیکار ہیں، میمنہ اور میسرہ حرکت میں ہیں اور قلب لشکر محوِ خواب ہے۔

جاگ بریلوی جاگ
او تیرے دین نوں لگ گئی آگ

بریلویت کی عظیم انقلابی صلاحیت کا اظہار حال ہی میں غازی ممتاز قادری کے اقدام سے واضح ہوتا ہے۔غازی کے عمل نے آناً فاناً لاکھوں شیدایانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ وار متحرک کر دیا۔اگر ہم ۲۰۱۳ء کے انتخابات غازی ممتاز قادری کی ذات کی بنیاد پر لڑتے تو ہماری انتخابی مہم خالصتاً مذہبی رنگ اختیار کر جاتی اور ہم ملک میں ایک عظیم انقلابی جدوجہد کا آغاز کر دیتے۔لیکن انقلابی جدوجہد کا آغاز کرنے کے بعد اس کی اداراتی صف بندی کیے بغیر اقتداری پیش رفت ممکن نہیں۔۱۹۷۷ء میں امام نورانی، میاں طفیل محمد اور مفتی محمود کی قیادت میں ہم نے ایک عظیم انقلابی تحریک تحریک نظامِ مصطفیٰ برپا کی تھی لیکن اس تحریک کو تنظیم میں نہ بدل سکے،اس کی اداراتی صف بندی نہ کر سکے۔تحریک نظامِ مصطفیٰ اور تحریک انقلاب ایران میں بنیادی فرق یہی تھا کہ علمائے ایران نے اپنی تحریک کو اقتداری تنظیم میں بدل لیا اور ہم یہ نہ کر سکے۔علمائے ایران کی کام یابی اس بات میں مضمر تھی کہ تحریک برپا کرنے سے قبل وہ پچھلے ستر سالہ دور میں معاشرتی اور ریاستی صف بندی کر چکے تھے۔ہم ابھی کوئی دیرپا انقلابی تحریک برپا نہیں کر سکتے کیوں کہ ہم نے وہ معاشرتی اور اقتداری اداراتی صف بندی نہیں کی ہے جو سرمایہ، دولت، ریاستی تنظیم کو مستحکم اور متحرک کرنے کے لیے ضروری ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس ادارتی صف بندی میں بریلویت کو لازماً ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا کیوں کہ ادارتی صف بندی کی بنیاد اسلامی شخصیت سازی کے عمل پر ہوگی اور شخصیت سازی ایک روحانی عمل ہے۔ جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے واضح فرمایا کہ قلوب میں تبدیلی کلامی بحثوں کے نتیجے میں رونما نہیں ہوتی بل کہ سلوک کی راہیں طے کر کے وہ معاشرے میں ان رسوم و رواج کے فروغ کے ذریعے پرورش پاتی ہے جو اسلامی عصبیت کو مستحکم کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اسی نوعیت کے طرائق اور رسوم و رواج کو فروغ دے کر قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلاسل نے برصغیر میں کروڑوں افراد کی اسلامی شخصیت سازی کی۔ بریلویت اسی مقدس ثقافتی ورثے کی امین ہے۔ بریلوی اکابرین اور جماعتوں پر فرض ہے کہ وہ ایسی ملک گیر روحانی اور معاشرتی تحریک برپا فرمائیں جو:

۱۔ برادری، خاندانی اور قبائل کی معاشرت کو اسلامی رسوم اور رواج میں اس طرح سمو دیں کہ برادری کے دین دار حلقوں اور بزرگوں کا اختیار اور اقتدار برادری اور خاندان کی سطح پر قائم اور مستحکم ہو۔

۲۔ پیرزادوں اور مخدوموں کی سیکولر نظام اقتدار میں شمولیت سے ایک ایسا صوفیانہ نظام اقتدار مرتب کریں جو اسلامی شخصیت سازی کو عمل جہاد یعنی تحریکات غلبہ دین سے منسلک کر دے۔ اس ضمن میں ۱۸۵۷ء کے جہاد کی معاشرتی صف بندی کے تجربات نہایت اہم ہیں۔

۳۔ اعلا حضرت احمد رضا خان اور حضرت امیر ملت کی تحریک ردِ بدعات کا احیا کریں اور اسلامی رسوم کی عمومی مقبولیت کو ماڈرن معاشرت اور سیکولر انفرادیت کی راہ میں ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا کر دیں اور وہ شکوک و شبہات جو اسلامی رسوم و رواج کے بارے میں اٹھائے گئے ہیں اور جن کی ترویج کے نتیجے میں مذہبی حلقے عملاً ماڈرن ہو رہے ہیں ان کا شرعی دلائل کی بنیاد پر محاکمہ کریں اور بالخصوص مزارات اور خانقاہوں کو اسلامی معاشرت کے ایسے مراکز بنائیں جہاں احکام شرع سے سرتابی ناممکن ہو جائے۔

ماڈرن ازم کا احیا

علمائے دیوبند اور بریلی نے انیسویں صدی میں ماڈرن ازم کو جو اعتقادی اور علمیاتی سطح پر شکست دی تھی وہ جزوی تھی۔ علمائے اسلام ماڈرن ازم کو سیاسی شکست نہ دے سکے بل کہ مسلم لیگ اور کانگریس اور انگریزی نظام اقتدار سے سمجھوتا کی بنیاد پر ہی اسلام کو علمیاتی اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معاشرتی سطح پر تحفظ فراہم کیا گیا تھا اور ہم اس بات پر مجبور ہو گئے تھے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے اس اجتہاد سے کہ ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے'' سہو نظر کریں۔ اس اجتہادی موقف کا احیا مولانا مودودی نے فرمایا۔ آپ نے اپنی متعدد تحریروں سے ثابت کیا کہ اسلام ایک خود کفیل نظام زندگی ہے اور اس کا مقابلہ مغرب سے ہے جو جاہلیت خالصہ ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی جدوجہد لازمی ہے اور یہی جدوجہد غلبہ دین کو تحفظ دین کا ذریعہ بنا سکتی ہے۔

مولانا مودودی نے جو جماعت قائم کی اس کی دو خصوصیات ہیں: ایک یہ کہ وہ کلامی جماعت ہے، فقہی یا مسلکی جماعت نہیں۔ مولانا مودودی نہ فقیہ تھے، نہ صوفی تھے، نہ محدث تھے۔ آپ ایک متکلم اسلام تھے اور علمائے ہند میں متکلمین شاذ و نادر ہی وارد ہوئے ہیں۔ مولانا مودودی کی فکر کو علما کے حلقوں میں جو اجنبیت ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ آپ نے مغرب کا اسلامی محاکمہ مرتب کرنے کی سعی کی ہے اور یہ ایسا محاکمہ ہے جو مغربی فلسفیانہ آدرشوں کی کسی اسلام کاری کی گنجایش نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف علامہ اقبال اپنی کتاب Reconstruction Of Religious Thought (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) میں فلسفہ کی اسلام کاری کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے اس کتاب کا رد ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' میں لکھا ہے۔

جماعت اسلامی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مغربی نظام زندگی کو کلیتاً بے دخل کرنے کی اصولاً قائل ہے اور اپنی جدوجہد کی یہی نظریاتی توجیہہ پیش کرتی ہے۔ یہ دونوں خصوصیات تحریک تحفظ دین اور غلبہ دین میں جماعت اسلامی کو ایک خاص فریضے کی ادائیگی کی ذمے داری سونپتی ہیں۔ وہ ذمے داری یہ ہے کہ یہ جماعت وہ ایسی مرکزیت فراہم کرے:

۱۔ جس کے اردگرد مختلف دائرہ کار میں مختلف مسالک کی پیروکار جماعتیں اپنے انفرادی کام کو ایک مربوط اجتماعیت میں ڈھالیں۔

۲۔ یہ اجتماعیت اس نوعیت کی ہو کہ اس کے نتیجے میں مغربی یعنی سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور نظام اقتدار منتشر اور مسخر ہو اور نظام اسلامی ہر سطح پر محفوظ اور مقتدر ہو جائے۔

۳۔ آج پاکستان میں جماعت اسلامی کے علاوہ تحریکات تحفظ اور غلبہ دین کو اس قسم کی محوریت فراہم کرنے والی کوئی اجتماعیت موجود نہیں۔ یہ جماعت اسلامی ہی ہے جو یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ مزکی، مبلغ، محدث اور مجاہد تنظیموں کو ان کے دائرہ کار اور مسلکی انفرادیت کو محفوظ رکھتے ہوئے اسے مربوط کرے کہ مغربی معاشرت، انفرادیت اور نظام اقتدار پسپا ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چلا جائے۔ جماعت اسلامی کا مقصد وجود اسی فرض کی ادائیگی ہے اور کوئی دوسری اسلامی جماعت اس فریضے کو انجام دینے کے لیے قائم نہیں ہوئی۔

ان معنوں میں جماعت اسلامی تمام کارکنان تحریکات اسلامی کی جماعت ہے۔ خواہ وہ مزکی ہو، مبلغ ہو، مدرس ہو یا مجاہد ہو، خواہ وہ دیوبندی ہو، بریلوی ہو، اہل حدیث ہو، شیعہ ہو، خواہ وہ صوفی ہو، مفتی ہو، امام مسجد ہو یا ایک عام مقتدی، جماعت اسلامی تمام کارکنان تحریکات اسلامی کی جماعت ہے اور اپنے نظاماتی محور کو محفوظ رکھنا اور اس کی فعالیت کو فروغ دینا تحریکات اسلامی کے ہر کارکن کی ذمہ داری ہے۔ آج جماعت اسلامی کا وجود شدید خطرے میں ہے۔ ماڈرن ازم کی یہ اصولی حریف آج ماڈرن ازم کی اسیر ہو رہی ہے ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا چلے

جماعت اسلامی نے کبھی بھی جمہوری عمل میں شرکت کو سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ مولانا مودودی کی فکر کی کمزوری ہے۔ اصولاً رد کرنے کے باوجود آپ نے جمہوری عمل کو خلافت کے مماثل قرار دیا اور شرح کے سیاسی احکام کی جو تشریح فرمائی وہ جیفرسن اور لاک کے نظریات اور مفروضات کی بنا پر کی۔ یہ تشریحات امام ابن خلدون، امام ابویعلی، امام ماوردی وغیرہ کی فکر اور اسلامی نظام سلطنت کے تجربات سے ماخوذ نہ تھیں اور بالکل اجنبی تھیں۔ جماعت اسلامی نے ۲۰۱۳ء کے انتخابی منشور میں اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ نظام کے مخلص اور دیانت دار کارندوں کے طور پر پیش کیا اور پورا زور اس بات پر رہا کہ جماعت اسلامی اقتدار میں آ کر پاکستان کو ایک ماڈرن اسلامی ملک بنائے گی اور عوام کے تمام سرمایہ دارانہ حقوق دیے جائیں گے کیوں کہ ریاست مدینہ اسکنڈے نیوین ریاستوں کی طرح ایک ویل فیئر اسٹیٹ تھی۔

۲۰۱۳ء کی عبرت ناک شکست° کے نتیجے میں جماعت اسلامی عمران خان کی بی ٹیم بن گئی اور جماعت اسلامی کے صوبائی امیر جناب سراج الحق صاحب وزیر خزانہ بن کر حکومتی سودی قرضہ کے لین دین کو منظم کرتے رہے ہیں اور ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک سے امداد طلب کرتے رہے ہیں۔ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ء تک آپ نے یہی کیا تھا۔

تحریک انصاف پاکستان کی وہی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی ہے جو اردگان نے ترکی میں بنائی جس کو اوباما فخر کے ساتھ نیٹو کی اسلامی پارٹی کہتا ہے۔ ترکی کی جسٹس پارٹی نے امام

° ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی نے آخری بار اکیلے انتخابات میں حصہ لیا اور اس کو مغربی پاکستان میں چھ فی صد ووٹ ملے۔ ۲۰۱۱ء میں اس کو صرف دو فی صد ووٹ ملے۔

www.kitabosunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اربکان کی اسلامی جماعت کو تنہا کیا ہے اور نور جو تحریک کو پورے ملک میں شدید نقصان پہنچایا ہے۔اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ تحریک انصاف کراچی اور پختون خوا میں جماعت اسلامی کو اسی طرح نگل جائے جیسے ترکی میں امام اربکان کی جماعت کو AKD نگل گئی ہے۔

پختون خوا کے ۲۰۱۳ء کے انتخابات دراصل مجاہدین اسلام نے جیتے ہیں اور انھوں نے اے این پی اور پی پی پی کو شکست دی ہے۔۲۰۰۲ء کے انتخابات کی طرح اس کا فائدہ اسلامی جماعتیں نہ اٹھا سکیں گو کہ پختون خوا میں اسلامی جماعتوں کے مجموعی ووٹ بارہ لاکھ تھے جب کہ تحریک انصاف کے ووٹ ساڑھے دس لاکھ تھے۔پختون خوا میں اسلامی ووٹ کی تقسیم کے نتیجے میں جماعت اسلامی جمعیت علمائے اسلام کی حریف بن گئی ہے اور قاضی حسین احمد کی اتحادی مساعی پر پانی پھیر دیا ہے۔پختون خوا میں جمعیت علمائے اسلام کو بیش تر مدارس و مساجد کی حمایت حاصل ہے اور اب وہ جماعت اسلامی کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے کیوں کہ جماعت اسلامی تحریک انصاف کی بی ٹیم بن گئی ہے۔ جمعیت علمائے اسلام مدارس، مساجد اور دینی نظام تعلیم کی فطری محافظ جماعت ہے اور اس کی اقتدار میں شرکت اس فریضے کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔اس کے برعکس تحریک انصاف پر مغرب زدہ ٹیکنوکریٹس اور Intellectuals کا غلبہ ہے جن کا استعماری تھنک ٹینکوں سے مسلسل رابطہ ہے۔لہٰذا اس کا امکان موجود ہے کہ تحریک انصاف پختون خوا میں اسلامی نظام تعلیم میں ردوبدل کی کوشش کرے اور جماعت اسلامی کو یہ فریضہ انجام دینے اور اس کا جواز فراہم کرنے پر راضی کرے۔ چوں کہ جماعت اسلامی کو اوقاف اور زکات وعشر کی وزارت دی گئی ہے اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ جماعت اسلامی تحریک انصاف سے یا تو جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرے یا پھر اس بات کی کوشش کرے کہ جمعیت علمائے اسلام بھی اس وزارت میں شریک ہو کر مذہبی وزارتوں کا قلم دان سنبھالے۔

جماعت اسلامی ہمیشہ اس بات سے غافل رہی ہے کہ اس کے اصل مخاطب دیگر تحریکات اسلامی کے کارکن ہیں اس کے مخاطب عوام کبھی بھی نہیں ہوسکتے کیوں کہ کلامی بحثیں عوام کے حال کو تبدیل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔لہٰذا عوام سے براہ راست تخاطب کے نتیجے میں جماعت عوام کے قریب آئی ہے، عوام جماعت کے کبھی قریب نہیں آئے۔چوں کہ جماعت عوام کی قلبی کیفیات بدلنے سے قاصر رہی لہٰذا عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ عوامی خواہشات کے حصول کی جدوجہد کا اسلامی جواز پیش کرے۔اسی لیے جماعت کی پالیسی سازی پر ماڈرن ازم کا غلبہ بہ تدریج بڑھتا جارہا ہے اور وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے اصلی کام یعنی تمام دفاعی اور اقدامی اسلامی تحریکات کو محور فراہم کرنے سے روز بہ روز غافل ہوتی جارہی ہے۔عوام سے براہ راست تخاطب کا کام مزکیوں اور مبلغوں کا ہے متکلمین کا نہیں اور یہ کام دعوت اسلامی، تبلیغی جماعت اور صوفیا کی خانقاہیں بہ خوبی انجام دے رہی ہیں۔ جماعت اسلامی میں یہ کام کرنے کی صلاحیت ہے نہ ضرورت۔ دینی حلقوں نے بھی جماعت اسلامی کی منفرد حیثیت کو نہ پہچانا کیوں کہ برصغیر میں کلامی بحثیں ہمیشہ سے اجنبی رہی ہیں۔ جیسے جیسے جماعت ماڈرنسٹ ہوتی جارہی ہے ویسے ویسے اس کی علما اور دیگر تحریکات اسلامی سے دوری بڑھتی جارہی ہے۔ماڈرن ازم کی بنیاد جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحی نے رکھی جب انھوں نے ۱۹۴۶ء میں Democratic Centralisasion کے اصولوں کے مطابق جماعت کا دستور مرتب فرمایا۔اس دستور نے جماعت کو ایک وین گارڈ پارٹی بنادیا۔ وین گارڈ پارٹی میں باہر والوں کے لیے گنجایش نہیں ہوتی اور وہ اندر والے جو پارٹی لائن سے مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتے ان کو بھی بے پس کر دیا جاتا ہے۔آج جماعت اسلامی کے باہر والے دیگر تحریکات اسلامی کے قائدین میں تھے۔ جماعت میں شامل علما عموماً بے بس اندر والے ہیں جو جماعت کی پالیسیوں سے پورے طور پر مطمئن نہیں ان کو خاموش کر دیا گیا ہے اور ''ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی'' تماش بین کا کردار ادا کررہے ہیں۔''باہر والے'' اور ''اندر والے'' تو قابل توجہ نہیں لیکن وین گارڈ پارٹی ماہرین اور سبجیکٹ اسپیشلسٹ اور ٹیکنو کریٹس کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھتی ہے۔وہ سمجھتی ہے کہ یہی ماہرین غیر اقداری سائنٹفک اصولوں کے مطابق کام یاب پالیسی سازی کی اہلیت رکھتے ہیں۔یہ ماہرین، آئی ٹی اسپیشلسٹ، اکاٹومسٹس، انجینئرز، مینجمنٹ سائنٹسٹ، وکیل اور صحافی، ماڈرن ازم کے وکیل بن کر وین گارڈ پارٹی پر چھا جاتے ہیں۔ان کی مشاورت پر وضع کردہ پالیسیوں کی پیہم ناکامیوں کے باوجود ان ماہرین کی فوقیت برقرار رہتی ہے کیوں کہ یہ نہ باہر والے ہوتے ہیں نہ اندر والے۔

جماعت اسلامی ایک ایسے وقت میں ماڈرن ہورہی ہے جب ماڈرن ازم ایک فرسودہ عمل اور ناکام نظریہ، انفرادیت، معاشرت اور ریاست ثابت ہوچکا ہے۔ماڈرن ازم کی ناگزیر شکست کا احساس مولانا مودودی کو خوب تھا۔آپ نے فرمایا تھا کہ ''وہ وقت دور نہیں جب سوشل ازم کو ماسکو میں اور سرمایہ دارانہ نظام کو واشنگٹن میں پناہ نہ ملے گی''۔ماڈرنسٹ سرمایہ دارانہ نظام زندگی ہر جگہ شکست وریخت کا شکار ہے۔''ماڈرنسٹ نظام اور عملیات پر وہ لوگ یقین رکھتے ہیں جو ماڈرن ازم کو بالکل نہیں جانتے'' یہ زیزک کا قول ہے۔ماڈرن ازم کا ماضی ہے، حال ہے لیکن ماڈرن ازم کا کوئی مستقبل نہیں۔جماعت اسلامی کو ماڈرن ازم سے بچانا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس لیے اشد ضروری ہے کہ جماعت اسلامی برصغیر میں مختلف النوع تحریکات اسلامی کی جدوجہد کو مربوط کرنے کا محور فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جماعت اسلامی کو ماڈرنسٹ تحریک میں ضم ہونے سے بچانے کے لیے جماعت کے اندر والے علما کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا۔ جماعت کے دستور میں یہ گنجایش پیدا کرنی ہوگی کہ:

۱۔ جماعت کا ہر کارکن، رکن اور رفیق کسی نہ کسی مزکی، یا مبلغ تنظیم مثلاً تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی یا کسی خانقاہی سلسلے سے وابستہ ہو کر روحانی اور اخلاقی تربیت سے مسلسل فیض یاب ہوتا رہے۔ چوں کہ جماعت اسلامی ایک کلامی جماعت ہے اس لیے تزکیہ وتربیت کا کام خود نہیں کرسکتی اور نہ اس کو اس قسم کے کام کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ جماعت اور اس کی برادر تنظیموں کے رفاہِ عامہ کے کام کو بھی دعوت اور تبلیغی کام کرنے والی جماعتوں کے کام سے مربوط کیا جائے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بعد جماعت وسیع پیمانے پر سوشل ورک اور ریلیف کا کام کر رہی ہے لیکن یہ کام خالص سیکولر مینجمنٹ کے اصولوں پر مرتب ہے اور اس کے نتیجے میں انفرادی اور معاشرتی سطح پر اسلامی عصبیت فروغ نہیں پا رہی۔

۳۔ باہر والے علما اور قائدین تحریکات اسلامی ہر سطح پر (محلّہ کی سطح پر، ضلع کی سطح پر، شہر کی سطح پر، صوبہ کی سطح پر، ملکی سطح پر) مستقل مشاورت اور اشتراک عمل کے لیے ادارتی صف بندی کی جائے۔ جماعت کے ہر فیصلے پر اس کی شرعی حیثیت کی تصدیق کرائی جائے اور باہر والے علما اور قائدین تحریک کی آرا کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہی پالیسی سازی کی جائے۔ یادش بہ خیر ایم ایم اے کی تشکیل کے دور میں قاضی حسین احمد صاحب نے تجویز دی تھی کہ مولانا خان محمد کی سربراہی میں ایک ''سپریم علما کونسل'' تشکیل دی جائے جو ایم ایم اے کے تمام فیصلوں کی شرعی تصدیق کرے۔

اس طریقہ کار کو اپنا کر جماعت اسلامی تمام تحریکات اسلامی کی رابطہ جماعت کا کردار ادا کرسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قائدین تحریکات اسلامی، صوفیائے عظام اور علما کرام نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے کام کو نظر انداز کیا ہے۔ آج بھی دیوبندی حلقوں میں مولانا مودودی کا نام طوعاً کرہاً لیا جاتا ہے۔ جب کہ مولانا ابوالحسن ندوی اور دیگر علمائے ندوہ اب بھی قابل تحسین سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بات عموماً بریلوی حلقوں کے لیے درست نہیں جہاں امام نورانی نے مولانا مودودی کی فکر کی تائید فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی ایک اقدامی تحریک ہے، دفاع اسلام کی تحریک نہیں اور ۱۹۲۰ء کے بعد سے اب تک مکتبہ دیوبند کا پورا زور دفاع اسلام پر ہی رہا ہے۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ علمائے دیوبند جماعت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام میں فاصلہ کم کرنے کی ذمہ داری قبول کریں۔ جماعت اسلامی کی عمران خان نواز پالیسیوں پر شرعی گرفت کریں اور جماعت کو اس بات کا احساس دلائیں کہ تحریک انصاف، جماعت اسلامی کو پختون خوا کی معاشرتی سیکولرائزیشن کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اسی لیے سراج الحق کو وزیر خزانہ بنایا گیا ہے کہ ورلڈ بینک، ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور یو ایس ایڈ سے امداد حاصل کرنے کی جستجو، ان تخریب کار استعماری اداروں کے نظام تعلیم، نظام سماجی بہبود اور نظام صحت کی پیہم سیکولرائزیشن کی جستجو سے یہ سہو نظر کریں اور جماعت اسلامی ان سیکولر اقدام کی اسلامی توجیہہ بیان کرنے لگے۔ ورلڈ بینک، ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور یو ایس ایڈ کی اس استعماری سیکولرائزیشن کو ناکام بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جمعیت علمائے اسلام پختون خوا حکومت میں شامل اور تعلیم، صحت اور بہبود آبادی کی وزارتیں علما کرام کے سپرد کی جائیں۔

سابق امیر جماعت اسلامی صوبہ سرحد مولانا معین الدین خٹک فرماتے تھے کہ ''یہ جماعت اسلامی کو چھوڑنے کا نہیں اس کو پکڑنے کا وقت ہے''۔ علمائے دیوبند بالخصوص حضرت حکیم الامت سے متعلق علما جماعت کو ماڈرنائز ہونے سے روکنے کے لیے کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں کیوں کہ مولانا مودودی کی فکر حضرت حکیم امت سے قدرے قریب ہے۔ آج علمائے دیوبند کا فرض ہے کہ جماعت اسلامی سے قریب ہو جائیں اس کے تمام فیصلوں پر شرعی جرح فرمائیں اور جماعت اسلامی کو ماڈرن ازم کو شکار ہونے سے بچالیں۔

فرقہ واریت کا زہر

لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ جرح تکفیری فتاوا کی شکل اختیار نہ کریں۔ اگر علما نے جماعت اور جمعیت کی بڑھتی ہوئی رنجش کے تناظر میں تکفیری فتوے دیے تو یہ صرف جماعت اسلامی کو ماڈرن ازم کے اور قریب دھکیلنے میں مدد دیں گے اور اس کے نتیجے میں تحریک اسلامی پختون خواہ کم زور سے کم زور تر ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا جماعت کی پالیسیوں پر تنقید ہم دردانہ اور مثبت ہونی چاہیے اور اس کا مقصد جماعت اسلامی کو یہ یاد دلانا چاہیے کہ مولانا مودودی ہی نے فرمایا تھا کہ ''مغرب جاہلیت خالصہ ہے''۔ آج جماعت ماڈرنائز ہونے کا کیا جواز پیش کرتی ہے؟ کیا یہ مولانا کی فکر سے صریح انحراف نہیں؟ کیا یہ روش اختیار کر کے اپنی وجودی انفرادیت کو کم زور نہیں کر رہی؟

ہماری معاشرتی کم زوری کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ یہ بات ہے کہ ہم اپنی مثبت

''محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ''

www.KitaboSunnat.com

تنقید صرف اپنے دشمنوں تک محدود رکھتے ہیں۔ جب مولانا فضل الرحمان امریکی سفیر اور سید منور حسن چینی زعما سے گفتگو کرتے ہیں تو ان کا لہجہ اور بیان نہایت سلجھا ہوا اور متوازن ہوتا ہے اور وہ اپنی شکایتوں کی فہرست نہایت شایستہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن آج کل سید منور حسن کو چین سے کوئی شکایت نہیں مولانا مودودی کو ہوا کرتی تھی۔ سید منور حسن سنکیانگ اور گانزو کے مجاہدین اسلام کو یک سر فراموش کر چکے ہیں کیوں کہ پاکستانی قومی مفادات کا یہی تقاضا ہے۔ ہمیں یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ امریکی سفیر اور چینی وزیر اعظم کافر ہیں اور نہ ہم اس ناخوش گوار حقیقت کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم اپنوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں یاد آجاتا ہے کہ بریلوی اہل بدعت ہیں اور دیوبندی گستاخِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اہل حدیث گم راہ ہیں اور جماعت اسلامی والے شاتمِ صحابہ کرام ہیں اور شیعوں کے حلیف ہیں اور شیعہ تو ہیں ہی کافر (کافر کافر شیعہ کافر جو نہ مانے وہ بھی کافر جو نہ بولے وہ بھی کافر اور جو بولے وہ بھی کافر) تو مسلمان کون ہیں؟ عمران خان، شہباز شریف، محمود خان اچکزئی، اوباما کی دادی اور ماؤزے تنگ کا تایا۔ یادش بہ خیر ایک زمانہ میں چین نواز کمیونٹی نے مشہور کیا تھا کہ ماؤ "عمر" کی چینی شکل ہے اور ماؤزے تنگ کا تعلق ایک قدیم مسلمان خاندان سے ہے۔ جنوبی چین میں یہ کہاوت کافی مشہور تھی۔

چھڑے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دیکھ ان کی حالت ہنسے سارا عالم

ائمہ مساجد فرقہ واریت کو ملک کے کونے کونے میں فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ ہر جمعہ کو اپنے مقتدیوں کو دوسرے فرقوں کی نیتوں پر شک کرنے، ان کے بداعتقاد ہونے اور ان سے علاحدہ رہنے کا درس دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تحریک احرار جس میں ایک زمانہ میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور شیعہ سب شامل تھے اور مولانا مظہر علی اظہر جیسے جید شیعہ عالم نے تحریک احرار کی ۱۹۳۷ء کی لکھنؤ میں شیعہ سنی اتحاد کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا آج تیزی سے ایک فرقہ وارانہ تنظیم بنتی جا رہی ہے۔ احرار کے ایک چوٹی کے رہ نما نے امام خمینی کو "دو پیروں والا خنزیر" کہا ہے۔ امریکا نے عراق، افغانستان، مصر، یمن، بحرین اور پاکستانی بلوچستان میں فرقہ وارانہ فسادات کو فروغ دینے کے لیے طاقت ور دہشت گرد تنظیمیں قائم کی ہیں۔ امریکا کی پوری کوشش ہے کہ کافر حکومتوں سے نبرد آزما مجاہدین اسلام میں فرقہ واریت کا زہر داخل کر کے ان کی عوامی پذیرائی کو ختم کر دے۔

عام مسلمان فرقہ واریت سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں فرقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وارانہ جماعتوں کو مجموعی طور پر ساڑھے چار کروڑ ووٹوں میں سے صرف ۸۱۴۰۸ ووٹ قومی اسمبلی کے لیے ملے یعنی اعشاریہ سترہ فی صد ہے۔امریکا اور اس کے مسلم فرقہ پرست دہشت گرد کہیں بھی شیعہ سنی فسادات کرانے میں کام یاب نہیں ہوئے۔نہ ایران میں، نہ لبنان میں نہ افغانستان میں، نہ سعودی عرب میں، نہ بحرین میں، نہ ہندستان میں، نہ پاکستان میں۔کیوں کہ مسلم عوام اپنی تمام تر کم زوریوں کے باوجود یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقہ واریت ایک قابل نفرت عمل ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔اور ائمہ مساجد کی فرقہ وارانہ روش ہی ان کی معاشرتی کم مائیگی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

تحریکات اسلامی کے قائدین کو اس کا پورا احساس ہے کہ فرقہ واریت سمِ قاتل ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک جتنے دینی اتحاد بنے ان میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ تمام جماعتیں شامل تھیں اور ایم ایم اے کو جو ۲۰۰۲ء میں انتخابی کام یابی حاصل ہوئی اس کی بڑی وجہ فرقہ واریت سے اجتناب تھا۔۲۰۱۳ء کے انتخابات میں بھی فرقہ وارانہ جماعتوں کو مجموعی اسلامی ووٹ کا اعشاریہ چار فی صد حصہ ملا۔میری رائے میں متحدہ دینی محاذ کوئی فرقہ وارانہ تنظیم نہیں بل کہ غلبہ دین کی تحریک ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری انقلابی معاشرتی حکمت عملی کا ایک کلیدی نکتہ محلّہ اور بازار کی سطح پر ائمہ مساجد کا انتظامی اقتدار قائم کر کے ان کو عوام کا واحد جائز مقامی قائد کے طور پر سامنے لانا ہے۔لیکن ایک امام جو ہر جمعہ کو اپنے محلے میں بسنے والے دیگر مسالک کے لوگوں کے عقائد اور رسوم پر لعن طعن کرتا ہے کس طرح معاشرتی قیادت کے لیے قابل قبول گردانا جاسکتا ہے۔ائمہ مساجد کی مقامی قیادت کو قائم کرنا ہے تو محلّہ کی سطح پر بین المسالک وفاق المساجد قائم کیے جائیں جن میں تمام اسلامی جماعتیں شریک ہوں اور جن کے فرائض میں یہ بھی شامل ہو کہ جمعہ کے خطبات کی مشترکہ تیاری کا انتظام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہر جمعہ کو محلّہ اور بازار کی ہر مسجد میں ایک ہی خطبہ دیا جائے۔

بین المسالک اخوت اور اتحاد کو فروغ دینا ہی اسلامی دفاعی اور اقدامی جدوجہد میں ارتباط پیدا کرنے کی جستجو کی عوامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ہر اسلامی جماعت کے پیش نظر سب سے اہم ہدف اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینا ہے۔یاد رکھیے کہ ہمارا بنیادی حلقہ اثر تقریباً دو کروڑ دین دار مخلص افراد پر مشتمل ہے لیکن یہ منتشر ہے، پریشان فکر بھی اور غیر منظم بھی۔تحفظ اور غلبہ دین کی جدوجہد کو مہمیز دینے کے لیے اس بنیادی حلقہ اثر کو منظم اور متحد کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔جیسا کہ ہمارے بزرگ شاعر صوفی نور احمد نے ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرمایا تھا۔

حق نوں بولو بلے بلے
رحمت رب نو بنھ لو پلے
کچھ نہیں بنتا کلم کلے
مل کر بن جاؤ طوفاں
اٹھ کھلوتا دیس دے اندر اللہ والیاں دا طوفان
ٹھیر نئیں سکدے طوفاناں دے اگے اے موڈرن شیطان

انتخابی نتائج.....ایک اجمالی تجربہ

۲۰۱۳ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی کو عبرت ناک شکست ہوئی ہے جس کی پوری ذمہ داری امیر جماعت اور جماعت کی قیادت پر جاتی ہے۔ اس عبرت ناک شکست سے واضح ہوگیا کہ جماعت کی مرکزی سیاسی قیادت نااہل اور ناسمجھ ہے وہ ملکی سیاست اور اس سیاسی نظام کے فاعل محرکات سے یا تو بالکل ناواقف ہے یا نظریاتی بنیادوں پر ان سے قصداً سہو نظر کرتی ہے اور جان بوجھ کر ایک ایسی Idealist سیاسی حکمتِ عملی اپنائے ہوئے ہے جس کا پاکستان کے زمینی سیاسی حالات میں کام یاب ہونے کا سرے سے کوئی امکان نہیں۔ جماعت کی سیاسی قیادت اپنے تاسیسی نظریات اور اپنی تاریخ کی قیدی بن کر رہ گئی ہے اور تاریخ نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی قیادت پر ماڈرنسٹ عناصر غالب ہیں اور ان کی روش جماعت کی معاشرتی تشخص اور اس کی سیاسی ساکھ کو ۱۹۷۷ء سے لے کر آج تک مستقل کھوکھلا کر رہی ہے۔

محترم امیر جماعت نے ۲۰۰۹ء میں ہی ''گو امریکا گو'' تحریک برپا کی۔ اس تحریک کا مقصد ملک میں امریکا مخالف سیاسی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ یہ ایک نہایت نادانش مندانہ فیصلہ تھا اور اس کے پیچھے کوئی ایسی معاشرتی اور ریاستی تحقیق موجود نہ تھی جو پاکستان میں پائی جانی والی امریکی مخالفت کی معاشرتی اور ریاستی نوعیت کا تعین کر سکے۔ ریاستی سطح پر تو امریکا مخالفت نہایت محدود اور بالکل غیر منظم ہے۔ چناں چہ کوئی بھی سیکولر جماعت مجاہدین اسلام کی تائید نہیں کرتی اور سب امریکا کے سامنے اپنی معذرتیں پیش کرتے ہیں اور اس سے خصوصی رعایتوں اور بھیک کے متقاضی ہیں۔ ریاستی سطح پر جو امریکا مخالف قوتیں موجود ہیں وہ منتشر اور متصادم ہیں۔ ایسے میں یہ تصور کرنا کہ ہم کوئی انتخابی امریکا مخالف محاذ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قائم کرلیں گے نادانش مندی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہاں کون سی قابل ذکر جماعت امریکا مخالف ہے؟ جمعیت علمائے اسلام دینی نظام تعلیم کے تحفظ اور اس کو ریاستی گرفت سے باہر رکھنے کے لیے امریکا سے تعاون ناگزیر سمجھتی ہے یہاں تک کہ مولانا فضل الرحمٰن، پرویز مشرف کے وکیل اور حمایتی بننے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ تو ضیاء الحق کے دور سے آج تک امریکا کی جیب میں ہیں۔ ایم کیو ایم اور تحریک انصاف کے ظہور اور بقا میں امریکا کا کلیدی کردار ہے۔ جو اسلامی جماعتیں امریکا مخالف ہیں وہ تو انتخابی عمل سے باہر ہیں۔ مثلاً جماعت دعوۃ، یہ انتخابی عمل میں کوئی وزن نہیں رکھتی اور جمعیت علمائے پاکستان، متحدہ دینی محاذ وغیرہ۔ ہم کوئی امریکا مخالف انتخابی محاذ اس لیے قائم نہ کرسکے کہ اس نوعیت کے محاذ کا قیام پاکستان میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا نے پاکستان کے سیاسی نظام نہایت موثر طریقہ سے Interpellate کرلیا ہے اور امریکا کی پاکستانی ریاستی ساکھ کو کم زور کرنے کے لیے جس معاشرتی اور ادارتی تعمیر و تسخیر کی ضرورت ہے وہ ابھی تک ناپید ہے۔ ان حالات میں گوامریکا گو تحریک چلانا محض پاکستانی ریاستی ساخت سے لاعلمی کا اظہار ہے۔

بہ حیثیت ایک اسلامی انقلابی جماعت انتخابات میں حصہ لینے کا مقصد اعلا سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو کم زور کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہم انتخابات میں سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں شمولیت اور اس نظام اقتدار کی اسلام کاری کے لیے حصہ لیتے ہیں اس کو برباد کرنے کے لیے حصہ نہیں لیتے۔ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو منہدم کرنے کے لیے تحفظ اور غلبہ دین کی تحریکات میں ریاستی سطح پر اشتراک عمل لازمی ہے اور اس اشتراکِ عمل کی بنیاد بھی لازماً جذباتی ہے نظریاتی نہیں اور جیسا کہ ایم ایم اے کی ۲۰۰۲ء کی مہم نے ثابت کر دیا اسلامی جذباتیت ہی کی بنیاد پر اسلامی Mass mobelisation ممکن ہوسکتی ہے۔ کسی نظریاتی آدرش کی عمومیت کے نتیجے میں اسلامی Mass mobelisation تاریخ میں نہ کبھی پہلے ممکن ہوئی ہے نہ آج ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اگر انتخابات میں عوامی پذیرائی حاصل کرنا ہے تو اسلامی جماعتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ الیکشن مندرجہ ذیل ایشوز پر لڑیں:

- .....حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- .....فروغ ثقافت و رسوم اسلامی
- .....تحفظ ختم نبوت اور آثار اسلامی
- .....تحفظ تقدس مساجد مدارس اور خانقاہ
- .....اعانت جہاد اور مجاہدین اسلام
- .....نفاذ شریعت

اس بنیاد پر ایک ایسا ملک گیر اسلامی انتخابی اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے جس میں تمام اسلامی جماعتیں شامل ہوتے پر اور تمام دعوتی جماعتیں اس انتخابی محاذ کی پشتی بان بننے پر مجبور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی جاسکتی ہیں۔

ہم نے ایسی کسی انتخابی محاذ آرائی کی کوئی کوشش نہ کی بل کہ جمعیت علمائے اسلام پر پے در پے اعتراضات کر کے ایم ایم اے کو دفن کر دیا۔ ان اعتراضات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم جمعیت کو سرمایہ دارانہ نظام اقتدار سے غیر مخلص گردانتے تھے اور اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جماعت اسلامی تو ریاستی دستوریت اور قانونیت پر ایمان لے آئی ہے، جمعیت علمائے اسلام کے لیے دستور اور پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون مقدس نہیں۔ وہ اس دستور اور اس قانون کو تحفظ مدارس، مساجد اور اسلامی نظام تعلیم کو ریاستی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہے اور اس میں بہت حد تک کام یاب ہے۔ ہم پاکستانی ریاستی نظام کے مخلص اور دیانت دار خادم بننا چاہتے ہیں۔ جمعیت کا یہ مقصد نہیں، اس کا مقصد ریاستی دفاعی جدوجہد کے ذریعے تحفظ دین ہے۔ وہ غلبہ دین کی تحریک ہونے کا دعوا نہیں کرتی یہ بات ہم اس طرح نہیں سمجھے جس طرح تحریک احرار نے جمعیت علمائے ہند کا موقف ۱۹۴۰ء کی دہائی میں نہ سمجھا تھا اور جس طرح ۱۹۴۰ء سے تحریک احرار کی Mass mobilization کی صلاحیت مستقل رو بہ زوال ہوتی چلی گئی ویسے ہی آج ہماری Mass mobilization کی صلاحیت مستقل رو بہ زوال ہے کیوں کہ ہم تحفظ دین کی جدوجہد کو غلبہ دین کی جدوجہد سے مربوط کرنے کے قائل نہیں۔ غلبہ دین کی جدوجہد کو تحفظ دین کی تحریک سے متصادم اور برتر سمجھتے ہیں اور ہماری رائے میں تحفظ دین کی تحریکات دین کی ہمہ گیریت کا صحیح تصور نہیں رکھتیں۔

ہم نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات ایک لبرل قوم پرست اور ماڈرنسٹ ایجنڈے کی بنیاد پر لڑے اور ہمیں عبرت ناک شکست ہوئی۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات میں ہمیں مغربی پاکستان میں چھے فی صد ووٹ ملے تھے۔ ۲۰۱۳ء میں ہمیں صرف دو فی صد ووٹ ملے۔ اگر ہم کراچی اور حیدرآباد میں بائیکاٹ نہ کرتے اور ہمیں ان شہروں میں زیادہ سے زیادہ اسی تناسب سے ووٹ ملتے جو ۱۹۷۰ء میں ملے تھے تو مجموعی ووٹوں میں ہماری شرح دو اعشاریہ آٹھ فی صد ہو جاتی۔ جمعیت علمائے اسلام کو ہم سے پچاس فی صد زیادہ ووٹ ملے اور اس نے اپنی ۱۹۷۰ء کی ووٹ کی شرح میں اضافہ کیا۔ خیبر پختون خوا کی صوبائی اسمبلی میں جمعیت کو ہم سے تقریباً دوگنا ووٹ ملے اور بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں جمعیت کو تمام سیاسی جماعتوں سے زیادہ ووٹ ملے۔ بلوچستان سندھ اور پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی کو اوسطاً ایک فی صد سے ذرا زیادہ ووٹ ملے یہ فی الواقع شرم ناک ناکامی ہے۔ اگر اتنی شدید اور ہمہ گیر شکست کے باوجود ہم نے تنظیمی ہیئت اور ریاستی اور معاشرتی حکمتِ عملی میں بنیادی تبدیلی نہ کی تو جماعت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی کو بہ حیثیت ایک معاشرتی اور ریاستی قوت کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونے سے کوئی چیز نہ روک سکے گی اور اس تباہی کی ذمہ داری اس ماڈرنسٹ قیادت پر عائد ہوگی جو جماعت میں نظریاتی اور ساختی ارتقا کی راہ میں پچھلے تین عشروں سے حائل ہے۔

ان معروضی حالات میں انتخابات ۲۰۱۳ء میں حصہ لینے کا فیصلہ غلط تھا کیوں کہ اس سے ہم صرف اپنی کم زوری واضح کر سکتے تھے۔ تحفظ دین کی جدوجہد میں کوئی کردار ادا کر سکتے تھے نہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو کم زور کر سکتے تھے۔ اب ہم اس سے بڑی غلطی کرنے والے ہیں اور اس کا مشورہ ہم کو وہ ماڈرنسٹ دانش ور دے رہے ہیں جن سے لیاقت بلوچ اور فرید پراچہ صاحب نے جون ۲۰۱۳ء میں مشاورت کی ہے اور جن میں ایک بھی عالم دین یا کسی اسلامی جماعت کا قائد شامل نہیں۔ یہ ماڈرنسٹ ہمیں Rule of Law سے وفاداری اور Policy flexibility کا مشورہ دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ متوقع بلدیاتی انتخابات میں زور وشور سے شرکت کرو اور اپنے مزید وسائل ضائع کرو۔ کیا اس سے دین کو تحفظ دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سے سرمایہ دارانہ حاکمیت کم زور پڑ سکتی ہے؟ بھلا ماڈرنسٹوں کو اس سے کیا سروکار؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جماعت اسلامی کی سیاسی اور معاشرتی کارکردگی

ارکانِ شورا کے نام کھلا خط

محترم اراکین شورا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کی توجہ کے لیے چند گزارشات پیش کر رہا ہوں جن کا تعلق جماعت کی حکمت عملی سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری انتخابی ناکامیوں کا تسلسل اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کی موجودہ تنظیمی ساخت اور اس کی ریاستی اور معاشرتی حکمت عملی پاکستان میں غلبہ دین کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے موزوں نہیں۔

ہم نے ان موضوعات پر عمومی بحث سے ہمیشہ پہلوتہی کی ہے کیوں کہ جماعت میں غالب گمان یہ ہے کہ ایسی عمومی بحث سے جماعت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ رائے غلط ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس عمومی بحث سے احتراض کر کے ہم تشکیلی اور حکمت عملی کے انجماد کا شکار ہو کر اپنی تاریخی روایات کے قیدی بن گئے ہیں اور ریاستی اور معاشرتی تغیر کو مہمیز دینے کی ہماری صلاحیت تقریباً معدوم ہو گئی ہے۔

اگر ہم اس دستوری اور حکمتی انجماد میں گرفتار رہے تو ہمارا حشر تحریک احرار سے مختلف نہ ہوگا جو ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کی عبرت ناک انتخابی شکستوں کے بعد عملاً مسلم لیگ میں ضم ہو کر فنا ہو گئی۔ ہمارے وجود کو خطرہ ان سے ہے جو جماعت کے دستور اور اس کی تاریخی روایات کو مقدس تصور کر کے تشکیلی اور حکمتی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہی روش جماعت کے وجود کے خاتمے کو ناگزیر بنا دے گی۔

تشکیلی اور حکمتی انجماد کے نتیجے میں ہم ماڈرن ازم کا شکار ہو گئے ہیں اور آج ہمارے سیاسی ایجنڈے اور تحریک انصاف کے ایجنڈے میں کوئی فرق نہیں۔ چوں کہ یہ دونوں سیکولر ماڈرنسٹ ایجنڈے ہیں لہٰذا حقیقی سیکولر جماعت یعنی تحریک انصاف ان کی فطری داعی ہے۔ تحریک انصاف کو اس ایجنڈے کی بنیاد پر عوامی مقبولیت حاصل ہوتی ہے ہم کو حاصل نہیں کیوں کہ عوام جانتے ہیں کہ ہم ایک مذہبی جماعت ہیں لہٰذا آج ہم پختون خوا اور کراچی میں تحریک انصاف کی بی ٹیم بننے پر مجبور ہیں، کل تحریک انصاف میں ویسے ہی ضم ہو جائیں گے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جیسے احرار مسلم لیگ میں ضم ہوئے تھے۔

تحریک انصاف سے قرب اور ماڈرنسٹ ایجنڈے پر عمل ہمیں ملک کی مذہبی قوتوں سے لازماً دور کر دے گا اور ان مذہبی قوتوں سے دوری ہمارے مذہبی تشخص کو تباہ کر دے گی۔ لہٰذا ماڈرن ازم کو ترک کرنے کے لیے تشکیلی اور حکمتی تغیرات جماعت کے لیے ضروری ہو گئے ہیں۔ یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس بات کی تفصیل اور تشکیلی اور حکمتی تغیرات کا اجمالی خاکہ اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے۔

جماعت کی روایات میں یہ بھی شامل ہے کہ نظریاتی اختلافات کو نظر انداز کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ منظر عام پر نہ آئیں۔ اس روش سے جماعت کو بے اندازہ نقصان ہوا ہے اور ۱۹۵۷ء سے لے کر آج تک وہ انٹراپی کا شکار رہی ہے۔ لہٰذا میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ یہ معروضات جماعت تک محدود نہ رہیں بل کہ ملک کے مذہبی حلقوں میں ان پر عمومی بحث ہو کیوں کہ جماعت کا وجود اور اس کے کام کا فروغ تمام دینی تحریکات کے لیے ضروری ہے۔

یہ معروضات ایک ایسے سرکل میں مرتب کی گئی ہیں جو جنوری ۱۹۹۲ء میں جناب قاضی حسین احمد کی ہدایت پر قائم ہوا اور پچھلے اکیس سال سے فعال ہے۔ اس میں جماعت اور دوسری اسلامی جماعتوں کے ارکان شامل ہیں۔

والسلام
جاوید اکبر انصاری
ستمبر ۲۰۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جماعت اسلامی کی سیاسی اور معاشرتی کارکردگی

گزارشات پیش کرنے کا مقصد

اس مضمون کا مقصد ایک ایسی حکمت عملی پیش کرنا ہے جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی پاکستان ایک طاقت ور معاشرتی اور ریاستی صف بندی کے طور پر ابھرے۔ پچھلے پچھتر سال میں ہم نے جو قوت مجتمع کی ہے وہ معاشرتی اور ریاستی سطح پر ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ معاشرتی اور ریاستی قوت میں اضافے کے لیے ہمیں دور رس تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔

حکمت عملی اور ساختی تنظیمی تبدیلیاں تاریخی طور پر ایک ناگزیر لیکن دشوار عمل ہے۔ ہماری پچھتر سالہ تاریخ میں جو روایات مستحکم ہوئی ہیں وہ ہماری شناخت اور ہماری بقا کی ضامن سمجھی جانے لگی ہیں لہٰذا ان کی قدر کرنا اور ان سے مسلسل وابستگی ایک فطری عمل ہے۔ جب بھی اپنی ادارتی ساخت اور اپنی معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی میں تغیر و تبدل کی ضرورت پر غور کیا جاتا ہے تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں جماعت انتشار کا شکار نہ ہو جائے لیکن انتشار کا یہ خطرہ ادارتی ساخت اور خارجی حکمت عملی کو اصولی طور پر منجمد کر کے بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔

برصغیر میں تحریک احرار اور یورپ میں سابق کمیونسٹ پارٹیاں اس نوعیت کے ساختی اور Strategic انجماد کے نتیجہ ہی میں انتشار کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ لہٰذا ساختی اور Strategic تغیر سے اس دلیل کی بنیاد پر انکار کہ اس کے نتیجے میں جماعتی زندگی مربوط نہ رہے گی اور جماعت کی معاشرتی شناخت لازماً مجروح ہو گی درست نہیں۔ جماعتی ساخت اور جماعتی معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی مقصود بالذات نہیں غلبہ دین کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ جماعت اسلامی غلبہ دین کے لیے قائم کی گئی اپنے قائم رہنے کے لیے قائم نہیں کی گئی۔ لہٰذا جب ہم اپنی معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی کی افادیت پر غور کرتے ہیں تو کلیدی سوال یہ ہے کہ کیا اس حکمت عملی کو بروئے کار لا کر ہمارا معاشرتی اور ریاستی تغلب بڑھ رہا ہے یا کیا ساختی اور حکمتی انجماد کے نتیجے میں ہماری معاشرتی اور ریاستی قوت اضمحلال کا شکار ہے۔ اگر ایسا ہے تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حکمتی انجماد کے نتیجے میں ہماری معاشرتی اور ریاستی شناخت لازماً انتشار کا شکار ہے اور اپنی ساختی اور حکمتی تنظیم میں تبدیلی کے بغیر ہم معاشرتی اور ریاستی سطح پر کبھی مقتدر نہ بن پائیں گے۔

راقم الحروف ۱۹۶۲ء سے جماعت اسلامی کا ایک عام کارکن ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ پاکستان میں غلبہ دین کے لیے جماعت اسلامی کا ایک مقتدر معاشرتی اور ریاستی قوت کے طور پر ابھرنا ناگزیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے سوا کوئی دوسری اسلامی جماعت غلبہ دین کا جامع تصور نہیں رکھتی لہٰذا کسی دوسری جماعت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تحفظ اور غلبہ دین کے ہمہ جہت کام کو مرتب کرے گی تاریخی حقائق سے سہو نظر کرنا ہے۔ لہٰذا پاکستان میں غلبہ دین کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے جماعت اسلامی کا معاشرتی اور ریاستی غلبہ ناگزیر ہے۔ غلبہ دین کا جو تصور مولانا مودودی نے پیش کیا اس کے دو اہم جزو ہیں جو آپ کو برصغیر کے دیگر اکابر علما سے منفرد کرتے ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات (Closed System) ہے۔

دوسرے یہ کہ مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

جہاں تک پہلے اجتہاد کا تعلق ہے ہماری ابھی تک کی جدوجہد کے نتیجے میں علمیاتی اور نظریاتی سطح پر ہم اس بات میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ مسلم فکر کے سوادِ اعظم نے اس رائے کو اصولاً قبول کر لیا ہے اور آج مولانا تقی عثمانی کے سوا کوئی بھی برملا نہیں کہتا کہ ''اسلام ایک مکمل نظام حیات نہیں محض ایک رویہ ہے'' لیکن عملاً تنفیذ نظام اسلامی کی جدوجہد میں کوئی بھی شریک نہیں۔ ہمارے سوا تمام قابل ذکر اسلامی جماعتیں اور گروہ اپنے مسلکی فرقہ سے وابستہ ہیں۔ یہ بات مجاہدین اسلام تک کے بارے میں بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ فرقہ واریت سے اوپر نہ اٹھ سکے اور بلوچستان میں لشکر جھنگوی اور جنداللہ جیسی امریکی آلہ کار جماعتوں سے اشتراک عمل کو معیوب نہیں سمجھتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بلوچستان میں شیعہ برادری پر جو ظلم اسلام کے نام پر کئی سالوں سے روا رکھا جا رہا ہے اس کے اوپر ہمارے سوا کسی غیر شیعہ اسلامی جماعت یا گروہ نے احتجاج نہیں کیا بل کہ بیش تر دیوبندی حلقے اس کا جواز پیش کرتے رہتے ہیں۔ فرقہ واریت وبا کی طرح پورے پاکستانی معاشرے میں پھیل رہی ہے اور یہ غلبہ دین کی راہ میں ایک نہایت اہم رکاوٹ ہے۔ ہمارا دشمن امریکا اس بات کو خوب جانتا ہے اور عراق کی طرح پاکستان میں بھی لشکر جھنگوی کے ذریعے شیعہ تکفیر کی ایک منظم معاشرتی مہم مرتب کر رہا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مولانا مودودی کا دوسرا اجتہاد ''مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' پاکستان میں بالکل اجنبی ہے اور کوئی بھی اسلامی گروہ بہ شمول جماعت اسلامی اس اجتہاد کو قبول نہیں کرتا۔ انیسویں صدی میں علمائے دیوبند، بریلی اور اہل حدیث نے مسلم ماڈرن ازم کو شکست دی تھی اور علوم و رسوم اسلامی کا گراں قدر خزانہ ماڈرنسٹ دست برد سے محفوظ رکھا تھا۔ لیکن اب یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ علما کی یہ فتح عارضی تھی اور مسلم ماڈرن ازم نے اسلامی ترمیم پسندی کی شکل میں ایک نیا روپ دھار لیا ہے۔ اسلامی ترمیم پسندی اس فکری منہج کو کہتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے آدرشوں اور ادارتی صف بندی کے شرعی جواز مرتب کرتی ہے اور شریعت کے حصار میں محدود سرمایہ داری کی تعمیر کی جدوجہد کرتی ہے۔

اسلامی ترمیم پسندی کی ابتدا شاہ فیصل کی بادشاہت کے دور میں ہوئی اور فیصل کی حکومت کی سرپرستی میں اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی ہندوپاک دونوں یورپ اور امریکا میں سرمایہ داری کی اسلام کاری کی مہمات ترتیب دینے میں مشغول ہوگئے۔ اس سرمایہ دارانہ اسلام کاری کا سب سے موثر اور دیرپا تجربہ اسلامی بینک کاری ہے جس کی سرپرستی فیصل کے بیٹے محمد الفیصل نے ''دارالمال الاسلامی'' کے قیام سے کی۔ لیکن سرمایہ داری کی اسلام کاری اقتصادیات تک محدود نہ رہی اور جیسا کہ امریکی مفکرین رابرٹ مشل اور لائنل بینڈر نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پیش گوئی کی تھی لبرل ازم کے بیش تر آدرش بالخصوص ہیومن رائٹس اور دستوریت سے متعلق موضوعات اسلامی جماعتوں کی سرمایہ دارانہ اسلام کاری کے دائرہ کار میں دھیرے دھیرے شامل ہوگئے۔ اسلامی ترمیم پسندی کے فروغ سے استعمار کی توقع ہے کہ وہ اسلامی جماعتوں کو اپنا حلیف اور مجاہدین اسلام کا دشمن بنالے گا۔ Roxana Euben کی کتاب Enemy in the Mirror ان توقعات کی تفصیل پیش کرتی ہے۔

اسلامک ری وژن ازم، علمی طور پر ماڈرنسٹ تحریک کا ایک ذیلی مکتب ہے۔ اس بات کا ادراک مشہور جرمن فلسفی یرگن ہابرماس کو اچھی طرح ہے جو پچھلی تین دہائیوں سے ایران میں اسلامک ری وژن ازم کے فروغ کی جدوجہد میں ایک اہم کردار ادا کررہا ہے۔ پاکستان میں اسلامک ری وژن ازم کے فکری رہنما مولانا تقی عثمانی، مولانا زاہد الراشدی، مولانا منیب الرحمن، علامہ طاہر القادری وغیرہ ہیں۔ جماعت اسلامی خود اسلامک ری وژن ازم سے متاثر ہے۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابی دستور میں وہ اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ ہم ''ترقی یافتہ جدید پاکستان بنائیں گے'' (صفحہ ۱۳) پورا منشور اسلامک ری وژنسٹ فکر کی غمازی کرتا ہے۔

اگر سرمایہ داری کی شریعت کاری کو قبول کرلیا جائے تو مولانا مودودی کا یہ اجتہاد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ ''مغربی تہذیب جاہلیت خالصہ ہے'' لغو اور بے معانی ہو جاتی ہے کیوں کہ جاہلیت خالصہ کی شریعت کاری عملاً ممکن نہیں۔ اگر ہم اسلامی ری وژن ازم کو ترک نہ کریں تو ہمیں لامحالہ اس اسلامی پروٹسٹنٹ ازم کی طرف لوٹنا ہوگا جس کی وکالت علامہ اقبال نے اپنے رسوائے زمانہ مقالہ "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں کی تھی[1]۔ اس نہج پر چل کر جماعتی شناختی انفرادیت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ سرمایہ داری کی شریعت کاری دیوبندی، بریلوی، شیعہ، اہل حدیث سبھی کرتے ہیں۔ عمران خان اور نواز شریف کو بھی اسی کی خواہش ہے بل کہ ۱۹۹۹ء میں جب آرک بشپ آف کنٹربری نے برطانیہ میں مسلمانوں کے لیے نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا تھا تو ٹونی بلیئر نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ شرع کی پابندی برطانوی امن اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں اور اس کے چند سال بعد ہی لیبر حکومت نے لیسٹر میں قائم ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جناب مناظر احسن کو Order of the Birtish Empire (OBE) کا تمغا دیا۔ ۱۹۲۳ء سے آج تک سعودی عرب میں شرعی احکام نافذ ہیں لیکن وہ سرمایہ داری کے فروغ اور ترقی میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوئے بل کہ اب تو یہ بات جزوی حد تک مصر، سوڈان اور ایران کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے[2]۔

ہمیں اگر اپنی معاشرتی اور ریاستی شناخت برقرار رکھ کر اس شناخت کو غلبہ دین کا ذریعہ بنانا ہے تو اس بات کا مکمل ادراک کرنا ہوگا کہ معاشرتی اور ریاستی سطح پر جن دو قوتوں کو شکست دینی لازمی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ فرقہ واریت ۲۔ ماڈرنزم

اس مضمون کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے معاشرتی اور ریاستی غلبہ کو، غلبۂ دین کا موثر ذریعہ کس طرح بنایا جائے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے جو حکمت عملی وضع کی جانے کی ضرورت ہے اس کے اجزا پر گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ:

۱۔ انتخاب کے نتائج کے تجزیے کے ذریعے اپنی ریاستی اور معاشرتی حیثیت کا اندازہ

---

[1] یاد رہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ہمیں علامہ اقبال کی اس کتاب کو اپنا ماخذ بنانے کا مشورہ ۱۹۶۶ء میں دے دیا تھا گو کہ وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ مولانا مودودی نے ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' Reconstruction of Religious Thought in Islam کی تردید میں ہی لکھی تھی۔

[2] سرمایہ داری کی شریعت کاری کا تجربہ یورپ میں چودھویں صدی سے شروع ہوا جب پادری Savanrola اطالوی شہر فلورنس میں غالب آیا۔ سترھویں صدی میں یہ کوشش سوئیزرلینڈ میں کیلون نے اور انگلستان میں کرومویل اور ڈیکسٹر نے کی۔ نتیجتاً ہر جگہ عیسائی نظام زندگی منتشر ہو گیا اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی غالب آ گیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لگائیں۔

۲۔ ان اسباب کا جائزہ لیں جن کے نتیجے میں ہماری ریاستی اور معاشرتی پیش رفت کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے۔

۳۔ پاکستانی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کی خصوصیات کی نشان دہی کی جائے تاکہ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک موثر اقدامی معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی وضع کی جاسکے۔

۲۰۱۳ء میں جماعت اسلامی کو عبرت ناک شکست ہوئی ہے جس کی پوری ذمہ داری امیر جماعت اور جماعت کی قیادت پر جاتی ہے۔ اس عبرت ناک شکست سے واضح ہوگیا کہ جماعت کی مرکزی سیاسی قیادت نااہل اور ناسمجھ ہے وہ ملکی سیاست اور اس سیاسی نظام کے فاعل محرکات سے یا تو بالکل ناواقف ہے یا نظریاتی بنیادوں پر ان سے قصداً سہو نظر کرتی ہے اور جان بوجھ کر ایک ایسی Idealist سیاسی حکمتِ عملی اپنائے ہوئے ہے جس کا پاکستان کے زمینی سیاسی حالات میں کام یاب ہونے کا سرے سے کوئی امکان نہیں۔ جماعت کی سیاسی قیادت اپنے تاسیسی نظریات اور اپنی تاریخ کی قیدی بن کر رہ گئی ہے اور تاریخ نے اس کو تاحال پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی قیادت پر ماڈرنسٹ عناصر غالب ہیں اور ان کی روش جماعت کی معاشرتی تشخص اور اس کی سیاسی ساکھ کو ۱۹۷۷ء سے لے کر آج تک مستقل کھوکھلا کر رہی ہے۔

ہم نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات ایک لبرل قوم پرست اور ماڈرنسٹ ایجنڈے کی بنیاد پر لڑے اور ہمیں عبرت ناک شکست ہوئی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ہمیں مغربی پاکستان میں چھے فی صد ووٹ ملے تھے۔ ۲۰۱۳ء میں ہمیں صرف دو فی صد ووٹ ملے۔ اگر ہم کراچی اور حیدرآباد میں بائیکاٹ نہ کرتے اور ہمیں ان شہروں میں اسی تناسب سے ووٹ ملتے جو ۱۹۷۰ء میں ملے تھے تو مجموعی ووٹوں میں ہماری شرح دو اعشاریہ آٹھ فی صد ہو جاتی۔ جمعیت علمائے اسلام کو ہم سے پچاس فی صد زیادہ ووٹ ملے اور اس نے اپنی ۱۹۷۰ء کی ووٹ کی شرح میں اضافہ کیا۔ خیبر پختون خوا کی صوبائی اسمبلی میں جمعیت کو ہم سے تقریباً دوگنا ووٹ ملے اور بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں جمعیت کو تمام سیاسی جماعتوں سے زیادہ ووٹ ملے۔ بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی کو اوسطاً ایک فی صد سے ذرا زیادہ ووٹ ملے، یہ فی الواقع شرمناک ناکامی ہے۔ اگر اتنی شدید اور ہمہ گیر شکست کے باوجود ہم نے تنظیمی ہیئت اور ریاستی اور معاشرتی حکمتِ عملی میں بنیادی تبدیلی نہ کی تو جماعت اسلامی کو بہ حیثیت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک معاشرتی اور ریاستی قوت کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونے سے کوئی چیز نہ روک سکے گی اور اس تباہی کی ذمہ داری اس ماڈرنسٹ قیادت پر عائد ہوگی جو جماعت میں نظریاتی اور ساختی ارتقا کی راہ میں پچھلے تین عشروں سے حائل ہے۔

ان معروضی حالات میں انتخابات ۲۰۱۳ء میں حصہ لینے کا فیصلہ غلط تھا کیوں کہ اس سے ہم صرف اپنی کم زوری واضح کر سکتے تھے۔ تحفظ دین کی جدوجہد میں کوئی کردار ادا کر سکتے تھے نہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو کم زور کر سکتے تھے۔ اب ہم اس سے بڑی غلطی کرنے والے ہیں اور اس کا مشورہ ہم کو وہ ماڈرنسٹ دانش ور دے رہے ہیں جن سے لیاقت بلوچ اور فرید پراچہ صاحب نے جون ۲۰۱۳ء میں مشاورت کی ہے اور جن میں ایک بھی عالم دین یا کسی اسلامی جماعت کا قائد شامل نہیں۔ یہ ماڈرنسٹ ہمیں Rule of Law سے وفاداری اور Policy flexibility کا مشورہ دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ متوقع بلدیاتی انتخابات میں زور وشور سے شرکت کرو اور اپنے مزید وسائل ضائع کرو۔ کیا اس سے دین کو تحفظ دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سے سرمایہ دارانہ جاکیت کم زور پڑ سکتی ہے۔

پیش رفت میں سست روی کے اسباب

۲۰۱۳ء کے انتخابی منشور کے مطابق جماعت اسلامی اپنے آپ کو ایک نظریاتی جماعت کہتی ہے اور یہ منشور اس نظریے کی تشریح پیش کرتا ہے۔ میں اس منشور کا جائزہ اس حیثیت سے لوں گا کہ کیا جو نظریہ اس دستور میں پیش کیا گیا ہے وہ غلبہ دین کی آرزو کو عوامی سطح پر فروغ دینے میں کتنا موثر ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ منشور جذبہ غلبہ دین کو عوامی سطح پر فروغ دینے کو ضروری ہی نہیں سمجھتا۔ منشور میں صفحہ ۸ پر لکھا ہے:

> ''اس جماعت کے نزدیک پاکستان میں کمی اس چیز کی نہیں کہ یہاں خدا، رسالت اور آخرت کے ماننے والے کم ہیں بل کہ اصل کمی یہ ہے کہ جس عقیدہ اور نظام کو یہاں کے باشندوں کی عظیم اکثریت حق مانتی ہے وہ عملاً نافذ نہیں ہو رہا۔''

وہ نافذ اس لیے نہیں ہو رہا کہ اس ''عظیم اکثریت'' کے عقیدہ اور اعمال میں تضاد ہے۔ یہ ''عظیم اکثریت'' تارک نماز، خائن، عیاش اور مطلب پرست ہے۔ وہ اصولاً منشور کی اس رائے سے متفق ہے کہ:

> ''کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اللہ کی اطاعت آخرت کی جواب دہی کے احساس اور رسالت کی رہ نمائی کو نظام زندگی کی بنیاد بنایا جائے۔'' (صفحہ ۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن عملاً سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو اپنانے کا زبردست ادعا رکھتی ہے اور جہاں وسائل اجازت دیتے ہیں سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی اختیار کرتی ہے۔ پاکستان کی عظیم اکثریت فاسق ہے (منافق نہیں) اس کے First order desire اس کے Second Order Desires سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک عام پاکستانی نماز نہیں پڑھتا لیکن وہ چاہتا ہے کہ نماز پڑھنا چاہیے، ہمارے منشور میں اس Second Order desire کو First Order Desire میں تبدیل کرنے کی کیا حکمت عملی ہے؟

اس نوعیت کے Second Order Desire کو First Order Desire میں تبدیل کرنے کی مثالیں صوفیا اور مجاہدین کی تحاریک میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ ہم سب نے پڑھا ہے کہ سید بادشاہ کے قافلہ کا جہاں سے گزر ہوتا تھا وہاں ہزاروں گناہ گار معاصی سے توبہ کر لیتے تھے۔ جب امام عالم گیر نے دکن پر فوج کشی کی تو لاکھوں ہندو آناً فاناً مشرف بہ اسلام ہوتے جاتے تھے اور مشہور مراٹھے سردار راؤ جگندر ❶ کا قول ہے کہ:

"جس نے بھی عالم گیر کو دیکھا وہ ایمان لے آیا"۔

کیا ہمارے منشور کو پڑھ کر یا اس کی شقوں کے نفاذ کے نتیجے میں کوئی شرابی یا زانی، شراب اور زنا سے توبہ کر لے گا؟

منشور کے صفحہ تیس اور اکتیس پر اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو فروغ دینے کے لیے گراں قدر تجاویز دی گئی ہیں اور یہ جماعت کی اسلامی شناخت کو واضح کرتی ہیں لیکن یہ مجموعی تجاویز کا ایک قلیل جزو ہیں۔ منشور میں بہ حیثیت مجموعی ۲۳۳ر اقدامات کے وعدے کیے گئے ہیں اور اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو براہِ راست فروغ دینے والے وعدوں کی تعداد آٹھ ہے یعنی مجموعی اقدامات کا تین فی صد۔ اس سے واضح ہے کہ اس منشور میں اسلامی شخصیت سازی اور معاشرتی صف بندی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ یہی بات جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کے منشور کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے بل کہ ہمارے منشور کی اسلامی شقیں علما کی جماعتوں کے منشور کی اسلامی شقوں سے زیادہ ہیں۔

لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ منشور کی تشکیل میں ضروریاتِ دین اور مقاصدِ شریعہ کے حصول کی کوئی واضح حکمت عملی موجود نہیں۔ جس کمیٹی نے منشور مرتب کیا اس کے سولہ ارکان میں صرف ایک عالم دین مولانا عبدالحق ہاشمی شامل تھے۔ جمعیت اتحاد علما تک کی کوئی شمولیت

❶ حضور شیواجی کی فوج کے جنرل تھے، ناگ پور کے رہنے والے تھے، مشرف بہ اسلام ہو کر غلام دست گیر رحمان ملا کا نام اختیار کیا، ۱۶۹۱ء میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ملک کے جید علما سے منشور کے ہر شق کے شرعی جواز کی سند لی جاتی اور منشور کی تیاری میں بنیادی جستجو اس بات کی ہوتی کہ منشور کی ہر شق مقاصد شرعیہ اور ضروریات دین کے حصول میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔

اس نہایت اہم بات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی شناخت کو فروغ دینے کی آٹھ تجاویز کا باقی دی گئی ۲۲۵ر تجاویز سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اور واضح طور پر نہ بتایا جا سکا کہ ان اقدامات سے اسلامی معاشرت اور شخصیت کیسے پنپے گی؟

ان ۲۲۵ر تجاویز کی عظیم اکثریت لبرل، سوشل ڈیموکریٹ اور مسلم قوم پرست آدرشوں سے ماخوذ ہے۔ اس منشور میں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی تردید کا کوئی تصور موجود نہیں بل کہ ان تجاویز کے نفاذ سے سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی توقع کی گئی ہے۔ لبرل تجاویز اس مفروضہ پر قائم ہیں کہ سرمایہ دارانہ تنظیم ملکیت تحفظ اور غلبہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ ہم لبرل قوانین کی دستوری حاکمیت کو فروغ دینا چاہتے ہیں کیوں کہ پاکستان کا دستور اور یہاں کا عدالتی نظام خالصتاً لبرل تصورات پر مروج ہے۔ ہم ''انصاف کی پابند اور دستور اور قانون کی پابند'' قیادت کو اقتدار میں لانا چاہتے ہیں اور ہمارے ملک کے پینل کوڈ اور Constitutional Law کی بنیاد خالصتاً لبرل تصورات پر مبنی ہے جن میں اسلامی پیوند کاری کا عمل بھی اپنی ابتدائی مراحل میں داخل نہ ہو سکا گو کہ قرارداد مقاصد کو منظور ہوئے چونسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ آئین اور قانون کی ''اصلاح'' کا کوئی پروگرام منشور میں شامل نہیں۔ ہم ملک میں لبرل ''آئینی اور جمہوری طریقوں سے نظام حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ (صفحہ۹)'' اور اسی لبرل نظام اقتدار میں ہمیں جب بھی موقع ملا ''ہم نے عوام کی بے مثال خدمت کی ہے۔ عوام ہمارے وزرا کی کارکردگی کے گواہ اور اسے تسلیم کرتے ہیں'' (صفحہ۱۰)۔ ہم ''ہر طرح کی دہشت گردی چاہے وہ ریاستی ہو یا گروہی کے شدید مخالف ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردی میں ملوث تمام عناصر کے خلاف (لبرل) قانون کے مطابق موثر کارروائی کی جائے'' اور ''ان اسباب کا مکمل خاتمہ کیا جائے گا جو نوجوانوں کو غلط راستوں کی طرف لے جاتے ہیں'' (صفحہ۱۴،۱۵)۔ یہ ''غلط راستے'' وہی ہیں جو لبرل قوانین اور دستور کے تقدس کے انکاری ہیں۔

ہم جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ مارکیٹ اکانومی کے مروجہ اصولوں کے مطابق کریں گے اور انگریزوں کی عطا کردہ زمینوں کو تمام (لبرل) قانونی تقاضے پورے کر کے ضبط کریں گے۔ ہم اسلامی نظام تکافل رائج کریں گے جو موجودہ سود کے بازار کا جز ولاینفک ہے۔ اینٹی

○ اس بات پر گفتگو کہ کیا مروجہ قوانین اس کی اجازت دیتے ہیں؟ دستور میں موجود نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مناپلی قانون سازی کا وعدہ کیا گیا ہے (صفحہ ۱۷) اور Consumer Protection کی Institutionalization کا بھی وعدہ ہے (صفحہ ۱۸)۔ موجودہ عدالتی تنظیم کو کالعدم کرنے کا کوئی تصور منشور میں نہیں ملتا بلکہ ''اعلا اور ماتحت عدالتوں کی تمام خالی اسامیوں کو چھ ماہ میں پر کیا جائے گا''۔ (صفحہ ۲۱)

ہم بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام اور قوانین کا پورا احترام کریں گے اور ''اقوام متحدہ کے قوانین اور سوئیزرلینڈ کی حکومت کی سہولت سے فائدہ اٹھا کر مختلف ادوار میں لوٹی ہوئی دولت واپس لائیں گے'' (صفحہ ۲۲)۔

واضح ہو کہ آج تک ان قوانین اور سہولت کے ذریعے کسی ملک کو اپنی لوٹی ہوئی دولت کا ایک پیسہ بھی واپس نہیں ملا ہے اور ان قوانین کے تحت بین الاقوامی قرضوں کی تنسیخ کا کوئی امکان موجود نہیں۔

معاشرتی سطح پر لبرل رجحانات کو فروغ دیا جائے گا ''بچیوں کے لیے کھیل اور تفریح کے اسٹیڈیم بنائے جائیں گے'' (صفحہ ۲۴)۔

کیا ایسے اسٹیڈیم مدینہ کی ماڈل ریاست میں موجود تھے؟

''خواتین کو ان کے حقوق عطا کر کے ملک کی ترقی میں ان کو کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا'' (صفحہ ۲۵)

''خواتین کو اعلا تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں گے اور ان کے لیے پیشہ ورانہ ماحول فراہم کیا جائے گا'' (صفحہ ۲۵)

کیا یہ بھی مدینہ کی ''ماڈل ریاست'' میں کیا جاتا تھا؟ نہایت شرم کی بات ہے کہ ایک اسلامی جماعت نظام کفالت کی بحالی کے لیے کوئی تجویز پیش نہیں کرتی۔ بل کہ خواتین میں پروفیشنل ازم کے فروغ کی خواہاں ہے۔

ہمارے منشور میں ہے کہ:

''لبرل معاشی پالیسیاں اختیار کی جائیں گی، نج کاری کا عمل جاری رہے گا اور اس میں پاکستانی سرمایہ داروں کو اہمیت دی جائے گی۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے لیے ہر لحاظ سے مکمل سرمایہ کاری کے پروجیکٹ تیار کریں گے۔ نئے ٹیکس لاگو نہیں کیے جائیں گے۔ فکس ٹیکس کا نظام رائج کریں گے۔'' (صفحہ ۲۶)

لبرل معاشرت کو فروغ دینے کا بنیادی ادارہ این جی او ہے۔

''ہم ملک کے تمام این جی اوز کے درمیان باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے خود ان کی مشاورت سے ایک پلیٹ فارم مہیا کریں گے۔'' (صفحہ ۳۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چوں کہ ہم لبرل ہیں لہٰذا:

''جماعت اسلامی میڈیا کی آزادی پر یقین رکھتی ہے اور میڈیا کو حکومتی دباؤ سے آزاد کرے گی اور اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ آئین کے آرٹیکل ۱۹ (الف) کے تحت اطلاعات اور معلومات تک میڈیا کو مکمل رسائی حاصل ہو'' (صفحہ ۳۲، ۳۳)

''میڈیا ہی کے تعاون سے اعلا اخلاق کو مدنظر رکھ کر ضابطہ اخلاق بنایا جائے گا۔ جس کی نگرانی خود میڈیا شخصیات کریں گی'' (صفحہ ۳۳، ۳۴)

''جماعت اسلامی آئی ٹی سیکٹر کو انڈسٹری اور اکنامی کا مین پلر قرار دیتے ہوئے پاکستان کو آئی ٹی کا ریجنل حب بنانے کی کوشش کرے گی'' (صفحہ ۳۴)

آئی ٹی کی صنعت کو آزاد کر کے عالمی لبرل معاشرت میں سمو دیا جائے گا اور استعماری تخریب کاری کے لیے جو نئے مواقع فراہم کیے جائیں گے ان کے سدباب کی کوئی تجویز منشور میں موجود نہیں۔ ایسا اسی لیے ہے کہ جماعت دستور میں بنیادی حقوق پر عمل درآمد یقینی بنائے گی (صفحہ ۳۵) اور یہ بنیادی سرمایہ دارانہ لبرل معاشرت اور انفرادیت کو فروغ دینے کے لیے ہی وضع کیے گئے ہیں۔ ان میں لبرل معاشرت اور ریاستی اقتدار کو فاٹا پر بھی مسلط کرنے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے (صفحہ ۳۶) تاکہ قبائلی معاشرت منتشر اور مجروح ہو۔

لبرل ازم کی طرح اس منشور میں مسلم قوم پرستی سے بھی غیر مشروط وابستگی کا اظہار کیا گیا۔ مسلم قوم پرستی سے وابستگی کا واشگاف اور برملا اظہار دفاعی اور خارجہ پالیسی کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ افواج پاکستان میں کسی ہیئتی تشکیلی تبدیلی کا کوئی تصور موجود ہے نہ اس بات کا ادراک موجود ہے کہ ہر نوآبادیاتی فوج کی طرح پاکستانی فوج بھی داخلی تحکیم کے لیے منظم کی گئی ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست کو تحفظ فراہم کرنا اس کا اصل وظیفہ ہے۔

ہم اس فوج کی معاشرتی اور ریاستی قوت میں اضافہ کے لیے اس کو ''جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں''۔ (صفحہ ۳۲)

اور اس فوج میں عورتوں کی شمولیت کے خواہاں ہیں۔ منشور کے مطابق:

''ہر پاکستانی عورت کے لیے فوجی تربیت کا لازمی خصوصی انتظام کیا جائے گا''۔

کیا یہ بھی مدینہ کی ماڈل ریاست میں ہوتا تھا؟

ایک اسلامی جماعت کی جدوجہد کا واحد مقصد حصولِ مقاصد شریعت اور ضروریات دین ہونا چاہیے۔ ہمارے منشور میں یہ کہیں نہیں کہا گیا بل کہ جدوجہد کا بنیادی مقصد

''پاکستان کو حقیقی معنوں میں اور مکمل طور پر خودمختار اور عالم اسلام کی قیادت کرتا جدید

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

مضبوط اور باوقار ملک بنانا ہے۔ (صفحہ ۱۳)

کیا یہ جدید پاکستان حصولِ مقاصد شریعہ اور ضروریات دین کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ تاریخ تو ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ "جدید ریاستیں مذہبی انفرادیت اور معاشرت کو بھسم کر دیتی ہیں اور مسلم قوم پرستی ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے جس میں اسلام کا لاحقہ خود فریبی کے علاوہ کچھ نہیں۔

منشور میں درج خارجہ پالیسی کے ضمن میں دیے گئے نکات یہ بات واضح کرتے ہیں کہ ہماری تجویز کردہ خارجہ پالیسی عالمی غلبہ دین کے حصول کا ذریعہ نہیں خالص پاکستانی قومی مفادات کے فروغ کا حصہ ہیں۔ اس خارجہ پالیسی میں جہاد افغانستان، عراق، یمن، صومالیہ، مالی، نائیجیریا، تاجکستان، عراق، شام، ازبکستان، سنکیانگ، اور گانزو کی اعانت کا کوئی ذکر نہیں۔

ہم تمام ممالک کے ساتھ برابری پر امن بقائے باہمی اور عدم مداخلت پر تعلقات استوار کریں گے۔ (صفحہ ۱۳)

ہم مشرقی ترکستان کی اسلامی تحریکات کی جدوجہد کو تنہا چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور چینی استعمار کے فطری پاکستانی حلیف بننا چاہتے ہیں۔ منشور کہتا ہے:

"چین سے تعلقات کو مزید فروغ دیا جائے گا اور زندگی کے تمام شعبوں میں باہمی تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں گی۔"

کشمیر جدوجہد کو بھی ہم جہادِ ہند کا حصہ نہیں بل کہ اس کو ایک War of National Libration گردانتے ہیں اور اس جہاد سے کسی عسکری تعاون کے قابل نہیں ہم:

"بھارت کے ساتھ متنازعہ امور پر بامقصد، جامع اور نتیجہ خیز مذاکرات کے ذریعے حل کرنے" کے قابل نہیں۔ (صفحہ ۱۶)

"ہمارے نظریے کی تیسری جہت سوشل ڈیموکریسی ہے۔ ہم نے اپنی عوامی اپیل اسی دعوے پر کی ہے کہ ہماری سابقہ حکومتوں نے بالخصوص کراچی میں عوام کی بے مثال خدمت کی ہے۔ اسی طرح حکومت سے باہر رہتے ہوئے بھی ہم پوری تندہی سے ادارہ "الخدمت" کے ذریعے سوشل ورک کرتے رہتے ہیں اور ہمارا دعوا ہے کہ اس بے لوث اور ان تھک خدمت کی کوئی اور مثال ملک میں نہیں ملتی۔ ہم سب سے زیادہ مخلص، دیانت دار اور باصلاحیت خادم قوم ہیں، اگر ہمیں اقتدار سونپا گیا تو ایک مکمل ہمہ گیر سوشل ویل فیئر پروگرام نافذ کرنا ہماری اولین ترجیحات میں سے ہوگا۔ ہم مہنگائی کا خاتمہ کر دیں گے، ہمارے نزدیک عام آدمی کا سب سے بڑا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ مہنگائی ہے'' (ص ۱۷) دین سے دوری نہیں۔

''ہم جی ایس ٹی کا مکمل خاتمہ کر دیں گے، آٹا، گھی، چاول، دالیں، چینی اور چائے کی قیمتیں بیس فی صد کم کر دیں گے۔ بجلی اور گیس میں شامل تمام ٹیکسوں کو ختم کر دیں گے۔ مہنگائی کے تناسب سے تنخواہوں میں مستقل اضافہ کرتے رہیں گے۔ (صفحہ ۱۷-۱۹)،

''میٹرک تک تعلیم مفت کر دیں گے۔ تمام افراد کو ذاتی مکان کی سہولت فراہم کی جائے گی، درآمد شدہ ادویات پر ٹیکس ختم کر دیں گے، ایک مثالی سوشل سیکورٹی سسٹم نافذ کریں گے اور کثیر وظائف فراہم کیے جائیں گے۔ بوڑھوں کے لیے اولڈ پیپلز ہوم بنائے جائیں گے، مزدور دوست لیبر پالیسی بنائی جائے گی۔ یونینوں کو اجرت اور ماحول کار کردگی متعین کرنے میں Collective Bargaining کے حقوق دیے جائیں گے، Wage Indexation کا نفاذ ہوگا، Privatisation کے عمل میں مزدوروں کو شریک کیا جائے گا۔'' (صفحہ ۱۶ تا ۲۹)

اس منشور سے جو نظریاتی تاثر ملتا ہے اس نے ہماری شکست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک لبرل اور سوشل ڈیموکریٹک نظریاتی تشخص کا آئینہ دار ہے اور اس میں جو اسلامی شقیں شامل کی گئی ہیں وہ نہایت محدود ہیں۔ ان دفعات سے ہمارا اسلامی تشخص واضح نہیں ہوتا۔ یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جو معاشی اور معاشرتی اصلاحات ہم کرنا چاہتے ہیں ان سے اسلامی انفرادیت اور اسلامی معاشرت کے فروغ کو کیسے مدد ملے گی؟ سوشل ڈیموکریٹک تشخص ہمارے لیے نہایت مضر ہے کیوں کہ مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور بالخصوص تحریک انصاف کا تشخص بھی لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ ہے اور ظاہر ہے لبرل ازم اور سوشل ڈیموکریسی سیکولر Constituency کو ہی اپیل کرتے ہیں ہماری بنیادی Constituency سیکولر نہیں مذہبی ہے۔ یہ بات ایم ایم اے کی ۲۰۰۲ء انتخابی کامیابی سے واضح ہوگئی تھی ہماری Constituency کا ووٹر سیاسی عمل میں جذبہ ایثار اور قربانی سے سرشار ہو کر حصہ لیتا ہے وہ حقوق کے حصول کی جدوجہد سے Motivate نہیں ہوتا، ہم جتنا زیادہ ماڈرن ہونے کی کوشش کریں گے اتنا زیادہ اپنی فطری Constituency کے لیے اجنبی ہوتے چلے جائیں گے۔

ہمارا یہ دعوا کہ ہم موجودہ نظام کو اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں کبھی مقبولیت عام حاصل نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ موجودہ نظام سرمایہ داری ہے اور اسی نظام کے فطری زعیم سیکولر ہوتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ سرمایہ داری ایک مذہب دشمن نظام ہے۔ اسلامی شخصیت اور اسلامی طرز زندگی گزارنے والا فرد سرمایہ دارانہ آدرشوں، قوم پرستی،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لبرل ازم اور سوشل ڈیموکریسی سے متاثر نہیں ہوتا۔

یہ ایک درست بات ہے کہ پاکستانی عوام کی بہت بڑی اکثریت غلبہ دین نہیں چاہتی اور سیاسی عمل میں ان کی شرکت اپنے حقوق کے طلب کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت کہ ایک واضح اقلیت ایسی بھی ہے جن کا اوڑھنا بچھونا قال اللہ اور قال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ خود ہمارے تقریباً چالیس ہزار ارکان اور ایک محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ کارکنان ہیں۔ ہم ملک کی ایک نسبتاً چھوٹی اسلامی صف بندی ہیں، مدارس، خانقاہوں، حلقہ ہائے ارادت، دیگر اسلامی جماعتوں اور مجاہدین اسلام کے حلقوں میں لاکھوں ایسے افراد موجود ہیں جن کی زندگیوں میں حقوق کا حصول ثانوی اور حصولِ رضائے الٰہی اولیت اور فوقیت کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک عام پاکستانی کی ذاتی اور خاندانی زندگی میں مذہب، بالخصوص مذہبی رسوم و رواج کا ایک اہم حصہ ہے اور بہت سے ایسے ایشوز ہیں جن پر عام پاکستانی کی مذہبی عصبیت کو ابھارا جاسکتا ہے۔ چوں کہ ہم ایک مذہبی جماعت ہیں لہٰذا ہمارا سیاسی ایجنڈا ماڈرن بن کر لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ کی اسلام کاری نہیں بل کہ مندرجہ ذیل دو قسم کے اقدامات میں پنہاں ہے:

۱۔ تمام اسلامی گروہوں میں اس شعور کو بیدار کرنا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے اور تحفظ اور غلبہ دین کے لیے سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اسلامی انقلاب کی جدوجہد ناگزیر ہے اور جماعت اسلامی کوئی ماڈرن جماعت نہیں بل کہ ایک راسخ العقیدہ مخلص فی الدین جماعت ہے جو تمام مزکیوں، مدرسوں، مبلغوں اور مجاہدوں کی جدوجہد کو مربوط کر کے سیکولرازم، لبرل ازم اور سوشل ڈیموکریسی کو شکست دے سکتی ہے۔

۲۔ جماعت ایک ایسے سیاسی ایجنڈے پر عمل کرے جو عوام کی اسلامی عصبیت کو حقوق کی سیاست سے نبرد آزما کر دے اگر ہم پچھلا الیکشن تحفظ ناموس رسالت پر لڑتے اور غازی ممتاز قادری کو بیس قومی اسمبلی کی نشستوں پر کھڑا کر دیتے تو ہماری مذہبی شناخت اجاگر ہوتی اور ہمیں تمام فرقوں سے والہانہ عوامی تعاون حاصل ہوتا۔

عوام کو وجدانی سطح پر ادراک ہے کہ ہم سرمایہ داری کے مخلص اور بے لوث خادم نہیں ہوسکتے کیوں کہ ہم جس سرمایہ داری کو فروغ دیں گے وہ لازماً شریعہ اور علوم اسلامی کی تحدید شدہ سرمایہ داری (Sharia Constrained Capitalism) ہو گی۔ اور جیسا کہ کرامویل اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیلوِن کے سترھویں صدی کے تجربات نے ثابت کیا ہے مذہبی علوم وقوانین سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو فروغ نہیں ہونے دیتے۔ یہ بات آج کی ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے تجربات سے بھی ثابت ہے اور ہمارے کراچی کے میئر شپ اور ایم ایم اے کے صوبائی حکومتی تجربات بھی واضح کرتے ہیں کہ لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ پالیسیوں کی تنفیذ سے مذہبی انفرادیت اور معاشرت فروغ نہیں پاتی۔ ہم خیبر پختون خوا اور کراچی میں اپنی بہتر حکومتی کارکردگی کے نتیجے میں اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو فروغ دینے میں کام یاب نہ ہو سکے اور ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی اپنا اسلامی تشخص تقریباً بالکل کھو چکی ہے۔[o]

جب عمران خان سرمایہ دارانہ نظام کا مخلص اور باصلاحیت رہ نما ہونے کا دعوا کرتا ہے تو عوام اس کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کیوں کہ وہ مولوی نہیں خالص سرمایہ دار ہے جب ہم اس قسم کا دعوا کرتے ہیں تو لوگ اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ ہم ساتھ ساتھ حرمت سود اور تحدید فواحش کا عزم ظاہر کرتے ہیں اور یہ چیزیں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سرمایہ دارانہ انفرادیت کے حامل لوگ اور سرمایہ دارانہ معاشرت کے خوگر ہمارے ماڈرن ہونے کے دعوے پر یقین نہیں کرتے۔

ہماری انتخابی پسپائی کی وجہ صرف نظریاتی نہیں تنظیمی بھی ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک ہماری موثر اسٹریٹ پاور تھی۔ اب ہم یہ اسٹریٹ پاور ہر جگہ بالخصوص پنجاب میں تقریباً بالکل کھو چکے ہیں۔ یہ بات ہماری ''گو امریکا گو'' کی تحریک کی ناکامی سے بالکل واضح ہو گئی۔ اس اسٹریٹ پاور کی تحلیل میں کئی مراحل آئے۔ پہلا دھچکا ۱۹۷۷ء میں لگا جب تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہم کو کام یابی تک پہنچانے کے بجائے ہم ضیاء الحق کے جھانسے میں آ گئے اور ہمارے وزیر فوجی انتظامیہ کے شریک کار بن گئے۔ پھر ۱۹۹۲ء کی اسلامی فرنٹ کی مہم نے ہماری مذہبی شناخت کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر ایم ایم اے کا انتشار اور اس کی صوبائی سطح پر نہایت مایوس کن کارکردگی کا شدید اثر ہماری عوامی قوت پر پڑا اور گو امریکا گو کی تحریک نے واضح کر دیا کہ ہمیں سڑک کی سطح پر یہ قوت حاصل نہیں رہی کہ ہم نظام سرمایہ داری کو معطل

---

o مصر میں اخوان کے حکومتی تجربات کے بارے میں اب تک کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ یقیناً اخوان جمہوری اور ماڈرنسٹ ایجنڈے کی بنیاد پر برسر اقتدار آئی لیکن کیا وہ اس اقتدار کو اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو فروغ دینے کے لیے استعمال کر سکے گی؟ اس کی ماضی میں دی گئی عظیم قربانیاں اور اس کی ہمہ جہتی معاشرتی جدوجہد نے مصری معاشرے میں اخوان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں چوں کہ ہم کبھی بھی کسی دور ابتلا سے نہیں گزرے لہٰذا ہم مصر کا تجربہ پاکستان میں نہیں دہرا سکتے۔ پھر ہمارے مقابل مسلم قوم پرست جماعتیں ہیں مصر میں ایسی جماعتوں کا وجود نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے ۲۰۱۴ء میں سیٹ ایڈجسٹمنٹ کی کوشش کی تو نہ مسلم لیگ نہ تحریک انصاف نہ جمعیت علمائے اسلام ہم سے سمجھوتا کرنے پر راضی ہوئے کیوں کہ ان جماعتوں کے تجربہ کار سیاست دان یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جماعت اسلامی کے پاس اسٹریٹ پاور ہے نہ کوئی ووٹ بینک ہے اور ان جماعتوں کو ہم سے سیٹ ایڈجسٹمنٹ نہ کر کے کوئی انتخابی نقصان ہونے کا احساس نہیں۔

لیکن ہم نے اپنی اسٹریٹ پاور محض strategic غلطیوں کی وجہ سے نہیں کھوئی اس کی بنیادی وجہ ہماری تنظیمی ساخت کی کم زوری ہے۔ یہ تنظیمی ساخت اسٹریٹ پاور کے اظہار کو institutionalise کر کے ایک مستقل سیاسی محرک بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۷۷ء کی عدیم المثال کام یاب عوامی تحریک تین ماہ کے اندر اندر مطلقاً تحلیل ہو کر رہ گئی اور ہم اس کی ادارتی صف بندی کر کے سیاسی اقتدار پر غلبہ کے قابل نہ ہو سکے۔

ایم کیو ایم اسٹریٹ پاور کو موثر طور پر Institutionalise کرنے کی واضح مثال ہے۔ آج اپنی اسٹریٹ پاور کی بنیاد پر ایم کیو ایم نے کراچی اور حیدر آباد کی ریاستی انتظامیہ کو اپنے ماتحت کر لیا ہے۔ وہ صرف مقامی ریاستی انتظامیہ میں دخول کی حکمت عملی نہیں بناتے بل کہ ان کی تنظیمی ساخت میں اس بات کا نہایت موثر انتظام کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو ریاستی انتظامیہ میں ان کے اثر و رسوخ کی بنیاد پر داخل کیا گیا ہے وہ پارٹی کی اپنی مقامی انتظامیہ کے ماتحت رہیں اور اپنی سیاسی قیادت کی حکم عدولی کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ ریاستی انتظامیہ کی اسی سیاسی انتظامیہ کی ماتحتی کے نتیجے میں ایم کیو ایم اپنی بڑھتی ہوئی غیر مقبولیت کے باوجود کراچی پر اپنی سیاسی گرفت قائم رکھے ہوئے ہے۔

ایم کیو ایم ایک کلاسیکی فاشسٹ جماعت ہے۔ ہم اس کی عوامی غیر مقبولیت سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جب تک پاکستانی زمینی حقائق کے مطابق اپنی اسٹریٹ پاور کو موثر طور پر institutionalise کرنے کی اہلیت نہ پیدا کر لیں۔

ہماری اسٹریٹ پاور کی تحلیل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنا رفاہِ عامہ کا کام اپنے دعوتی مذہبی کام اور اپنے سیاسی کام سے ملحق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارا رفاہِ عامہ کا کام نہایت تیزی سے پھیلا ہے لیکن اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کے نتیجے میں معاشرے میں مذہبیت کا اضافہ ہوا نہ غلبہ دین کی جدوجہد کو مہمیز ملی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رفاہِ عامہ اور برادر تنظیموں کا کام دعوتی سرگرمیوں سے مربوط کرنے کی کوئی کوشش کی گئی نہ سیاسی جدوجہد سے۔ آج ''الخدمت'' کو جاپان اور جرمنی اسی لیے اعانت فراہم کر رہے ہیں کیوں کہ یہ استعماری ممالک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہمارے رفاہِ عامہ کے کام کو سیاسی طور پر بے ضرر تصور کرتے ہیں۔ رفاہی کام کو ایک معاشرتی mass base بنانے کا ذریعہ ہم نے کبھی تصور نہیں کیا۔

ہم محض ایک نظریاتی جماعت نہیں ایک تصوراتی جماعت بھی ہیں۔ ہم ماڈل بناتے ہیں اور حقیقت ان معروضی ''ماڈلوں'' کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ''ماڈلوں'' کا حقیقت سے صرف ایک خفیف اور مبہم تعلق ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے ۲۰۱۳ء کے منشور میں صفحہ ۱۱۲-۱۱۳ پر مدینہ کا جو ''ماڈل'' تصور کیا ہے اس کا تعلق خلافت راشدہ کے بالمقابل ڈنمارک اور سویڈن سے زیادہ ہے اس ماڈل میں جہاد کا کہیں کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کہ جو وظائف دیے جاتے تھے وہ غنائم کی تقسیم کی بنیاد پر دیے جاتے تھے اور جب مال غنیمت تنگ ہوتا تھا تو وظائف بھی منقطع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا کسی بھی اسلامی سیاسی مفکر نے رعایا کے لیے لباس، صحت اور تعلیم کا مناسب انتظام کرنا خلیفہ کے فرائض میں شمار نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے خطباتِ بہاول پور میں صریحاً لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری چند سالوں کے استثنا کے علاوہ خلافت راشدہ کے دور میں کبھی بھی عوام کے ویل فیئر حقوق کی فراہمی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس ہر دور میں ہر سال لاتعداد سرایہ اور غزوات جاری رہے۔ ہمارا ''ماڈل'' ''خلافت راشدہ تفریق جہاد جمع سوشل ویل فیئر'' کا ماڈل ہے جو تاریخی حقیقت سے بہت کم تعلق رکھتا ہے۔

مدینہ کی ریاست اور اس کی معیشت بنیادی طور پر ایک جہادی ریاست اور معیشت تھی۔ اگر پاکستان میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو زیادہ امکان اسی کا ہے کہ ہم حالت جنگ میں داخل ہو جائیں گے لیکن ہماری Idealistic سوچ ہمیں اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کرنے دیتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا دور سے ہمارے ''ماڈل'' کو تحسین سے دیکھے گی اور کبھی حملہ آور ہو کر اس کو نیست و نابود کرنے کی کوشش نہ کرے گی۔ اس بات سے سہو نظر کرنا کہ انقلاب کے بعد تاریخ میں عموماً خانہ جنگی ہوتی ہے، خود فریبی کے علاوہ اور کیا ہے؟

ہمارے منشور میں ''جہاد'' اور ''انقلاب'' کے الفاظ کہیں نہیں پائے جاتے حال آں کہ جیسا کہ ایران، افغانستان، چیچنیا، سوڈان، یمن، عراق، شام اور مالی کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہم نے جب بھی ایک اسلامی ریاست قائم کی جہاد ناگزیر ہو جائے گا اور ہمیں غلبہ دین کی جدوجہد کا محور اور مرکز جہادی عمل ہی کو بنانا چاہیے اور عوام کو بڑی بڑی معاشی اور معاشرتی قربانیاں دینے کے لیے تیار کرنا چاہیے جیسا کہ امام خمینی نے ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک کیا اور اس دور میں عوام سے کوئی بھی ویل فیئر وعدہ نہ کیا۔ اس کے برعکس ہم نے لاتعداد مادی ترغیبات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور لالچ عوام کو اپنے ۲۰۱۳ء کے منشور میں دیے ہیں بغیر یہ دیکھتے ہوئے کہ پاکستان کا بجٹ ان سہولتوں کی فراہمی کا متحمل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اس غیر حقیقت پسندانہ روش کی سب سے واضح علامت یہ ہے کہ ہم نے حکومتی صَرف کو بڑھانے کی سترہ تجاویز دی ہیں لیکن حکومتی آمدن بڑھانے کی کوئی بھی تجویز موجود نہیں۔ شعبہ جاتی تجاویز بھی نا قابل عمل اقدامات سے بھری پڑی ہیں۔❶

ہماری اس غیر حقیقت پسندانہ روش کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے تحقیقی اداروں، بالخصوص انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور لاہور اور کراچی کی اسلامک ریسرچ اکیڈمیوں نے پاکستانی انفرادیت، معاشرت اور ریاستی تنظیم پر ایسا مواد مہیا نہیں کیا۔ بالخصوص enthnographic اور (Localised techno economic surveys) جس کو بنیاد بنا کر ہم ایک حقیقت پر مبنی معاشرتی اور ریاستی اقدامی حکمت عملی مرتب کر سکیں اور اس حکمت عملی کو وقوع پذیر رجحانات اور معاشرتی اور ریاستی تفسیرات کی بنیاد پر ری ویو کرتے رہیں۔ بالکل جیسے ہمارا دعوتی اور معاشرتی کام ہمارے سیاسی کام سے مربوط نہیں ویسے ہی ہمارے علمی اور فکری کام ہماری سیاسی اور معاشرتی جدوجہد سے مربوط نہیں۔ ہمارے فکری کام کے مخاطبین تو عموماً معاشرتی اشرافیہ طبقے ہوتے ہیں جماعت اسلامی کے کارکن نہیں ہوتے۔

پاکستانی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کی خصوصیات

ان گزارشات کا مقصد ایک ایسی حکمت عملی مرتب کرنا ہے جس کی تنفیذ کے نتیجے میں جماعت اسلامی تحفظ اور غلبہ دین کی تمام تحریکات کے کام کو سمیٹے اور اس کے نتیجے میں ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کی صلاحیت بہ تدریج حاصل کرے۔ اس حکمت عملی کو بیان کرنے سے پہلے میں دور حاضر میں پاکستانی انفرادیت، معاشرت اور ریاستی تنظیم کی نمایاں خصوصیات بیان کروں گا اور اسی تناظر میں ایک حقیقت پسندانہ حکمت عملی مرتب کرنے کی کوشش کروں گا۔

انفرادیت

۱۔ فرد کی سطح پر آبادی کا معتدبہ حصہ روایتی اقدار کا حامل ہے اور اسلامی اقدار سے قبیلہ اور برادری کی سطح پر قریب تر ہے۔

❶ اس کے برخلاف توانائی کے بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو تجاویز دی گئی ہیں وہ حقیقت پسندانہ اور قابل عمل ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ اس شعبہ میں ہم نے گراں قدر ہوم ورک کیا ہے۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

۲۔ لوگ ماڈرن انداز زندگی کو اپنا رہے ہیں جس کا بنیادی عامل سیاسی سے زیادہ معاشی ہے۔ تبدیلی اقدار کا سلسلہ کم زور ہے۔

۳۔ پرانی روایات و اقدار کا منبع پرانا ہندو معاشرہ ہے جو کہ حفظ مراتب پر قائم ہے۔

۴۔ ہندو اور بدھ اقدار جو فرد کی سطح پر سرایت کیے ہوئے ہیں۔ جو کہ بسا اوقات مانع آتی ہیں اسلامی اقدار کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے میں۔ جدید اقدار کو اپنانے میں میڈیا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

۵۔ معاشی عوامل کی بنا پر فرد کی سطح پر قوم پرستانہ سوچ و عمل غالب آرہی ہے جس کی بنا پر مقامی روایات و تہذیب کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ قوم پرستانہ سوچ شخصیت کو Disintigrate کر کے اس میں تغیر پیدا کر رہی ہے۔ افرادی سطح پر ریاستی نظام فرد کو قوم پرستانہ اقدار کے بین حرص و حسد، بغض و عناد کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے۔

۶۔ فرد کی سطح پر ایک عام پاکستانی فاسق ہے منافق نہیں۔ وہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتا ہے اور جو گناہ سے پرہیز کرتے ہیں ان کی قدر کرتا ہے لیکن ان جیسا بنتا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی آبادی کی ایک بڑی اکثریت غلبہ اسلام کی ضرورت سے آگاہ ہے لیکن غلبہ اسلام نہیں چاہتی۔

۷۔ فرد کی سطح پر اسلامی اخلاقیات کم زور پڑ رہی ہیں۔ وہ معاشی اور سیاسی معاملات میں اسلامی اصول و مبادی کو فیصل نہیں سمجھتا۔

۸۔ فرد کی سطح پر ایک عام شخص مختلف النوع تضادات کا شکار ہے۔ تضاد سے پیدا ہونے والا عدم تحفظ کا احساس اسے اسلامی اصول و اقدار سے دور کر رہا ہے۔

معاشرت

۱۔ پاکستانی معاشرہ بڑی حد تک سرمایہ دارانہ تشکیل کو معاشرے کی سطح پر قبول کر چکا ہے۔

۲۔ پاکستانی معاشرہ اپنی نفسانی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل چاہتا ہے۔ وہ اس بنیاد پر اپنے خیر و شر کا تعین کرتا ہے۔

۳۔ پاکستانی معاشرے میں ایمان داری، نسب و شرافت، خاندان اور کفو کی اہمیت ماند پڑ رہی ہے۔ برادریاں، قبیلے اور قوم حتا کہ مذہبی ادارے بھی سرمایہ دارانہ تعقل کو قبول کرنے کے لیے اس کو مذہبی جواز فراہم کر رہے ہیں۔ بالخصوص پنجاب میں معاشرہ تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ خطوط پر استوار کیے جا رہا ہے۔

۴۔ اسلامی جماعتیں کچھ معاشرتی رفاہی کام کرتی ہیں اس کا تناظر دینی کم اور ریاستی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زیادہ ہوتا ہے۔ اور سیکولر جماعتوں کی بی ٹیم بن کر سرمایہ دارانہ نظام ریاست و معاشرت کو جواز فراہم کرتی ہیں۔ اور اسلامی ریاست امارت و خلافت کی جدوجہد سے دست کش ہو جاتی ہیں۔

۵۔ پاکستان میں گو کہ آج بھی مذہب معاشرت اور تہذیب کا بنیادی عامل ہے بل کہ یہ معاشرت کی سطح پر ایک موثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسلامی جماعتوں کے سہو نظر کی بنا پر مذہب کلچر کی سطح پر محض ذاتی سکون حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا جا رہا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مذہب کلچر کی سطح پر آئے بغیر ایک علم کتابی ہے۔ پاکستان میں مذہب کو معاشرت اور فرد کی سطح پر لائے بغیر اس کا رشتہ اسلام کے ساتھ جوڑنا بہت مشکل ہے۔

ریاست

۱۔ پاکستانی ریاست ایک سرمایہ دارانہ ریاست ہے جہاں حاکمیت کی بنیاد عوامی نمایندگی ہے۔ یہاں علوم شریعہ کے بجائے سوشل سائنسز کی بالا دستی ہے اور شرع کے بجائے دستوری قانون نافذ ہے۔

۲۔ پاکستانی ریاست ایک لبرل سرمایہ دارانہ ریاست ہے اور زمام اقتدار خواہ جمہوری ہو یا ڈکٹیٹر شپ ہمیشہ ان لوگوں کو حاصل رہا ہے جو سرمایہ دارانہ اقلیت کو فیصل سمجھتے ہیں اور اسی سرمایہ دارانہ تعقل کو اپنے اقتدار کی وجہ جواز سمجھتے ہیں۔

۳۔ پاکستانی سرمایہ دارانہ لبرل ریاست سرمایہ دارانہ خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔

۴۔ بنیادی طور پر پاکستانی ریاست فوجی لبرل ریاست ہے اور شروع دن سے یہ ایک باج گذار ریاست رہی ہے۔ کیوں کہ پاکستانی فوج بری، بحری اور فضائیہ کے پہلے سربراہ انگریز استعمار کے کارندے تھے۔

مستقبل کی حکمت عملی

برصغیر کی تاریخ میں اسلامی تحریکات گاہے گاہے ابھرتی اور بکھرتی رہی ہیں۔ ہماری قریب ترین پیش رو تحریک اسلامی احرار الاسلام ہے۔ یہ تحریک خلافت کی شکست و ریخت کے نتیجے میں ۱۹۲۰ء کی دہائی میں قائم ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی اور ۱۹۲۰ء کی دہائی کا پہلا نصف اس کا نکتہ عروج تھا۔ تحریک پاکستان نے اس کو برباد کر دیا اور یہ پنجاب میں مسلم قوم پرستی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ۱۹۳۰ء کے وسط سے اس نے ہنگامی سیاست کو اپنایا اور تنظیم اور معاشرتی اور ریاستی عمل تغیر کا کوئی واضح تصور دینے اور حقیقت پر مبنی منصوبہ بندی کرنے میں ناکام رہی۔ اس کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بنیادی کم زوری مزاحمتی عمل کی ادارتی صف بندی میں ناکامی رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے مسلم قوم پرستی کو قبول کرلیا اور امیر شریعت نے سیاست سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد اس میں مسلکی عصبیت غالب آئی اور شیعہ اور بریلوی علما اور عوام جو اس میں شامل تھے خارج کر دیے گئے۔ اب یہ ایک پریشر گروپ ہے اور اس کا ایک نکاتی ایجنڈا تحفظ ختم نبوت ہے۔ عملاً اب یہ ملتان کے ایک محلّہ تک محدود ہے گو کہ وسط پنجاب کے چند شہروں میں شاہ جی کے خاندان کے وابستگان اب بھی موجود ہیں۔ تحریک احرار جس کے متعلقین لاکھوں میں گنے جاتے تھے اور جس سے پنجاب کی مسلم لیگ اور یونی نسٹ پارٹی تھر تھر کانپتی تھی اب نواب زادہ نصر اللہ کی تانگہ پارٹی بن گئی ہے۔[1]

میری رائے میں احرار کی شکست و ریخت کی دو وجوہات ہیں ایک فکری اور تنظیمی انجماد اور دوسری مہماتی سیاست۔ ہم تحریک احرار کے وارث ہیں اور ان شاء اللہ ان دونوں خطرات سے جماعت اسلامی کو محفوظ رکھیں گے۔ ہماری نظریاتی بنیادیں تحریک احرار کے مقابلے میں بہت مستحکم ہیں۔ اپنی استعمار مخالفت اور غلبہ دین کے عزم کے باوجود تحریک احرار کے پاس نہ اسلام کا ایک مکمل اور خود انحصاری نظام حیات ہونے کا تصور تھا نہ مغرب کا جاہلیت خالصہ ہونے کا تصور۔ یہ دونوں تصورات مولانا مودودی کے خاص اجتہاد ہیں اور ان میں اتنی ہمہ گیریت اور وسعت ہے کہ ان کے تناظر میں تمام دینی مدافعاتی اور اقدامی تنظیموں اور تحریکوں کو جمع کیا جاسکتا ہے۔

ہم ابھی تک یہ کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ہمارے کام کی محدودیت اور بے اثری کی سب سے اہم وجہ ان تصورات کو اہل دین کے حلقوں میں بقبولیت عمومی نہ دلا نا رہی ہے ہمارے تنظیمی ڈھانچے میں یہ گنجایش نہیں کہ دیگر تحریکوں کے کام سے اپنی جدوجہد کو مربوط کرسکیں۔ یہ بات ایم ایم اے کی ناکامی سے واضح ہوگئی کہ ہمارا دیگر دینی جماعتوں سے رابطہ سطحی اور محض سیاسی اغراض کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اور صرف ان تحاریک کی بالائی قیادت تک محدود رہتا ہے۔ اس اتحاد کے نتیجے میں دیگر تحاریک کا ایک عام کارکن ہمارا مخاطب نہیں بنتا۔ دیگر تحاریک میں ہمارے کلیدی نظریات کہ ''اسلام مکمل خود انحصار نظام دین ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' مقبولیت حاصل نہیں کرتے۔ نہ ہمارا اپنا کارکن دیگر دینی جماعتوں کے کام اور آدرشوں کی اہمیت کا شعور حاصل کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دیگر دینی تحاریک

---

[1] یادش بہ خیر نواب زادہ نصر اللہ خان اور میاں طفیل محمد مرحوم دونوں احراری تھے اور میاں صاحب کو شاہ جی نے ہی جماعت اسلامی میں شمولیت کی ترغیب دلائی تھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے کارکنوں کو مخاطب کرنے کی انتظامی استعداد پیدا نہیں کر پائے اور ہمارا تنظیمی ڈھانچہ اور ہمارا دستور اس کو فروغ دینے کے لیے موزوں ساختی تناظر فراہم نہیں کرتا۔ اس تنظیمی ڈھانچے اور دستوری ساخت کو منجمد کر دیا گیا تو ہم تحریک احرار کی طرح اپنی تاریخ کے قیدی ضرور بن جائیں گے اور ہمارے شناختی انحطاط کو کوئی چیز نہ روک سکے گی۔ اگر جماعت اسلامی کو تحریک احرار کے انجام سے بچنا ہے تو یہ دستور اور تنظیمی ڈھانچے کو منجمد کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تاریخ کے قیدی نہ بنیں اور اپنے دستور اور اپنی تنظیمی ساخت میں وہ تبدیلیاں بہ تدریج لائیں جن کے باعث ہم دیگر تحریکات اسلامی کے کام سے اپنے کام کو مربوط کر سکیں اور مولانا مودودی کے دو کلیدی نظریات ''اسلام ایک مکمل خود انحصاری نظام حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' پر وہ بنیاد فراہم کریں جس کے اوپر پاکستان میں تحفظ دین اور غلبہ دین کا تمام کام مرتکز ہو۔ یہ کام دیگر تحریکات اسلامی سے اشتراک تنظیم اور اشتراک عمل رائج کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔

مولانا مودودی متکلم اسلام تھے۔ آپ مزکی، فقیہ، مبلغ یا مجاہد نہیں تھے[o]۔ ہمارا کام مولانا مودودی کے علم کلام کو مقبولیت عامہ دلا کر تحفظ اور غلبہ دین کی جاری جدوجہد کو موثر بنانا ہے۔ متکلمین کے مخاطب عوام نہیں ہو سکتے، خواص ہوتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ نے یہ بات خوب اچھی طرح اپنے رسالہ 'فیصل التفریق بین السلام والزنادقہ'' میں سمجھائی ہے۔ امام علیہ رحمۃ لکھتے ہیں:

> ''یہ سمجھنا کہ ایمان کو کلامی مباحث معروضی شواہد کی فراہمی اور منطقی استدلال سے فروغ دیا جا سکتا ہے، بدعت ہے، ایمان وہ نور ہے جو خدا اپنے بندوں کے دلوں میں براہ راست ڈالتا ہے۔ تیقن ایمان کبھی الہام سے حاصل ہوتا ہے کبھی رویائے صادقہ سے کبھی کسی ولی اللہ کا نور قلب اپنے مرید کے دل میں منعکس ہو جاتا ہے۔ جو تقویت ایمان کلامی بحثوں سے حاصل ہوتی ہے وہ نہایت محدود اور کم زور اور بہت آسانی سے شاطر کفار و زنادقہ کی دلیلوں سے شکست کھا جاتی ہے۔ ایمان راسخ عوام الناس کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے ان کی بچپن کی تربیت کے نتیجے میں یہ ایمان روزمرہ کے مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ تقویت ایمان صرف عبادات اور اذکار کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے''۔ (صفحہ ۱۲۱، ۱۲۴)

---

o تاریخ اسلام میں یہ تمام صفتیں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضوان اللہ علیہم میں جمع تھیں اور کسی میں نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متکلمین کا کام تزکیہ نفوس نہیں (یہ مزکیوں اور مربیوں کا کام ہے) متکلمین مزکیوں، مدرسوں، مبلغوں اور مجاہدین اسلام کو وہ دلائل براہین اور حکمت (بہ شمول حکمت عملی) وضع کر کے فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے تحفظ دین اور غلبہ دین کی جدوجہد فتح یاب ہو سکے۔ متکلمین کا کام نہایت اہم اور ناگزیر ہے اور سوائے وہابیوں کے کسی نے بھی علم کلام کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن علم کلام تحفظ دین اور غلبہ دین کی محض ایک جہت ہے اور اس کی افادیت اسی وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب اس کو دوسری دینی جہتوں، تزکیہ و اذکار تفقہ، تدریس، تبلیغ اور جہاد سے مربوط کیا جائے۔

اگر مولانا مودودی کے کلام کو اعلا حضرت کے تصوف، حضرت انور شاہ کاشمیری کی فقہ، مولانا الیاس کی تبلیغ اور حضرت امیر المومنین کے جہاد سے مربوط کرنا ہے تو ہمیں یہ علم کلام مولانا کاشمیری، اعلا حضرت، مولانا الیاس اور حضرت امیر المومنین کے معتقدین کے لیے قابل فہم اور قابل قبول بنانا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کو براہ راست مخاطب کرنے کو ترک کرنا ہوگا۔ اس براہ راست عوامی تخاطب کی عدم موثریت ہم پر عملاً واضح ہو چکی ہے لہٰذا ہمارا ۲۰۱۳ء کا انتخابی منشور سوشل ڈیموکریٹ لبرل اور مسلم قوم پرست وعدوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کی روح رواں ماڈرن ازم ہے اور اس منشور میں مغرب کے جاہلیت خالصہ ہونے کا تاثر بالکل ناپید ہے۔ ہماری ہر معاشی اور معاشرتی تجویز نظام سرمایہ داری سے مصالحت کی تجویز ہے۔

جماعت اسلامی کے فطری مخاطبین عوام نہیں دوسری تحریکات اسلامی کے کارکنان ہیں۔ ملک میں ایسے افراد کی تعداد جو دینی شعائر اور تقاضوں کو اپنے معاشی اغراض پر مقدم رکھتے ہیں لاکھوں میں ہے اور ان کی بڑی اکثریت کسی نہ کسی حلقہ ارادت سے منسلک ہے۔ اگر ہم اپنے دعوتی کام کو ان حلقہ ارادت (تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، مدارس، خانقاہ، صوفی سلاسل، امام بارگاہوں) کے قریب کر دیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارے معاشرتی اور ریاستی اقدامات اور تنظیم میں دیگر اسلامی جماعتوں کے عام کارکن شریک کار بن جائیں تو ہم ان لاکھوں افراد کو جنھوں نے اپنی زندگیاں مختلف اسلامی تنظیموں اور قیادتوں کے سپرد کر دی ہے عوام الناس تک پہنچنے کا موثر ذریعہ بنا دیں گے۔

چوں کہ ہم ایک کلامی صف بندی کر چکے ہیں لہٰذا ہمارے آدرش اور مباحث صرف ان لوگوں کے لیے متاثر کن ہو سکتے ہیں جو پہلے سے ہی تحفظ دین اور غلبۂ دین کو اپنی زندگیوں کا مقصد بنا چکے ہیں یہ وہی افراد ہیں جو ملک کی تمام راسخ العقیدہ اسلامی تنظیموں کے وابستگان ہیں۔ یہ افراد ہی ہماری فطری constituency ہیں، اسی Constituency کو معاشرتی اور ریاستی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سطح پر متحرک کر کے ہم عوام الناس تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ constituency اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ عوام کی قلبی کیفیات کو متاثر کرے۔ ہم یہ صلاحیت خود کبھی develop نہیں کر سکتے کیوں کہ ہم متکلمین کی جماعت ہیں اور اگر ہم اپنی فطری constitutency کے توسط کے بغیر عوام سے مخاطب ہوئے تو جیسا کہ ہمارا تہتر سال کا تجربہ ہے کہ ہم عوامی قلبی کیفیات کو متاثر نہ کر سکیں گے اور اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ عوامی حصولِ لذات کی خواہشات کو سیاست کاری کے لیے ایک لازمی ضرورت کے طور پر قبول کریں اور ایک لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ پروگرام کی علامتی اسلام کاری کو اپنی سیاسی جدوجہد کا محور اور مرکز بنائیں۔ یہی اسلامی Revisionism ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم مولانا مودودی کے ان دونوں بنیادی اجتہادات ''اسلام ایک مکمل اور خود کفیل نظام زندگی ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' سے عملاً رجوع کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

اگر ہم غلبہ دین کی جدوجہد کو ان دو بنیادی نظریاتی اجتہادات کہ اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام زندگی ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے، کے محور سے مربوط کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں جس نظام زندگی کی شکست و ریخت کے لیے جدوجہد کرنی ہے وہ سرمایہ داری ہے۔ ہم نے اپنی کتابوں[1] میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج جو نظام زندگی غالب ہے وہ سرمایہ داری ہے[2]۔ آج انفرادی، معاشرتی اور ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو ہی غلبہ حاصل ہے اور ان تینوں سطحوں پر سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست سرمایہ دارانہ آدرشوں اور اعمال کو لایعنی اور غیر موثر بنانا ہی غلبہ دین کی ضرورت ہے۔ خطرہ اسی بات کا ہے کہ ہم مزکی، مدرس، مبلغ اور مجاہدین سب ری وژنسٹ مباحث اور مہمات کے ذریعے اسلامی شخصیت، معاشرت اور ریاست کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں سمو دیں گے اور اپنے قول و عمل سے ثابت کر دیں گے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے نہ مغرب جاہلیت خالصہ ہے بل کہ سرمایہ دارانہ آدرشوں اور اعمال کے ذریعے ہی مقاصد شریعت اور ضروریات دین حاصل ہو سکتی ہیں۔

بہ حیثیت ایک انقلابی کلامی جماعت یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اسلامک ری وژنسٹ رویوں کو نا معقول، غیر مقبول اور مضر ثابت کریں۔ ہم یہ واضح کریں کہ سرمایہ دارانہ

---

[1] ''سرمایہ دارانہ نظام: ایک تنقیدی جائزہ''، ''انقلابی عمل: ایک اسلامی تجزیہ''، ''سرمایہ دارانہ عقائد و نظریات''

[2] اور اس کو محض ''مغربی تہذیب'' سمجھنا آج خلاف واقعہ ہے، سرمایہ دارانہ نظام زندگی کئی تہذیبی شکلیں اختیار کر سکتا ہے جیسا کہ جاپان، چین اور مشرقی ایشیائی ممالک کے تجربات سے واضح ہے اور ان ممالک بالخصوص چین میں آج مغرب کے مقابل میں سرمایہ دارانہ نظام زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عدل ظلم کے علاوہ کچھ نہیں۔ سرمایہ دارانہ اقدار آزادی، مساوات اور ترقی کے فروغ کے نتیجے میں انفرادی معاشرتی اور ریاستی سطح پر حرص و ہوس، شہوت اور غضب کا غلبہ ناگزیر ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت، Huminities سوشل اور نیچرل سائنسز جہل مرکب اور معرفت کی ضد ہیں۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی تحلیل کا کام سرمایہ دارانہ نظام کے اندر سے ہی ممکن ہے۔ عالم گیریت کے اس دور میں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا غلبہ بھی عالمی ہے اور گو کہ سرمایہ دارانہ غلبہ علاقائی سطح پر ختم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ مجاہدین اسلام کی جدوجہد سے ثابت ہے لیکن اس نوعیت کی علاقائی فتوحات سرمایہ دارانہ فکری اساس اور تنظیمی تغلب کو متاثر نہیں کرتیں۔ امریکی فوجیوں نے ویت نام میں جو جنگ ہاری تھی وہ آج کوکا کولا نے جیت لی ہے اور ویت نام مشرق بعید میں ایک اہم امریکی حلیف ریاست ہے۔ علمائے دیوبند اور بریلی نے مغربی علوم سے اسلامی فکر کو محفوظ رکھنے کے لیے انیسویں صدی میں جو مدارستی قلعے تعمیر کیے تھے وہ ایک ایک کر کے اسلامی ری وژن ازم کا شکار ہو رہے ہیں اور انھی مدارس سے یوسف القرضاوی، وحید الدین خان، طاہر قادری، منیب الرحمٰن، راشد الغنوشی، زاہد الرشدی اور تقی عثمانی جیسے سرمایہ دارانہ استعمار کے حلیف برآمد ہو رہے ہیں۔ آج پورے عالم اسلام میں معدودے چند بے سروسامان، مفلوک الحال اور منتشر مجاہدین کے علاوہ مغرب کو جاہلیت خالصہ کون کہتا ہے اور ع ''یک زبان ہیں فقیہان شہران کے خلاف''۔

ہماری حکمت عملی کا پریکٹیکل ہدف سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے اندر سے سرمایہ دارانہ آدرشوں اور عملیات کو غیر معقول، غیر معتبر اور غیر موثر بنانا ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہم مولانا مودودی کے بنیادی نظریاتی اجتہادات ''اسلام ایک مکمل خود انحصاری نظام حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' کی علمی اور عملی تصدیق فراہم کر سکیں گے اور آپ کے ان اجتہادات کو تاریخ اسلامی میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت بنا دیں گے۔

مودودی پیارا مودودی
مودودی تارا مودودی
ایک امرت دھارا مودودی
ہم سب کا سہارا مودودی

اگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور عوامی ویل فیئر کے حقوق کے لیے سرمایہ دارانہ عدل[1] کے

[1] سرمایہ دارانہ عدل یہ ہے کہ تقسیم وسائل و درجات کا تعین اس اصول کے مطابق ہو کہ ہر فرد کا حصہ اس کے سرمایہ کی بڑھوتری میں کی گئی خدمت کے مطابق ہو اور ہر شخص کو سرمایہ کی افزائش کو فروغ دینے کے یک ساں مواقع دیے جائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصول کو اپنی جدوجہد کا مرکز اور محور بنائے رکھا تو مولانا مودودی کی فکر، تحفظ اور غلبہ دین کی مختلف النوع تحریکات کو مجتمع نہ کر سکے گی اور بہ تدریج فرسودہ ہوتی جائے گی۔ جماعت اسلامی ایک ری وژنسٹ پریشر گروپ بن جائے گی اور تاریخ میں ہمارا مقام تحریک احرار سے مختلف نہ ہوگا۔

ذیل میں اس حکمت عملی کے چند اجزا کی نشان دہی کروں گا جس کو اپنا کر ہم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر سے اس کی شکست و ریخت کو حاصل کر سکیں۔

۱۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ہمیں تمام راسخ العقیدہ اسلامی دفاعی اور اقدامی تحریکات کو اپنا فطری مخاطب اور حلیف تصور کرنا چاہیے۔ ان تحریکات کے کارکن ہی ہماری اصل Constitutency ہیں۔ ان سے تخاطب کو فروغ دینے کا ایک موثر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا دعوتی کام، دروس، غیر انتظامی اجتماعات وغیرہ علاقہ کے سب سے زیادہ موثر اسلامی گروہ (کہیں تبلیغی جماعت، کہیں دعوت اسلامی، کہیں کسی شیخ کا حلقہ ذکر، کہیں کسی عالم کی محفل) کے کام میں ضم کر دیں اور جب ہمارے کارکن ان حلقوں میں اپنا اعتبار قائم کر لیں تو ہم حلقہ کے دیگر شرکا کو غلبہ دین کی ضروریات اور جماعت اسلامی کی اساسی فکر سے گاہ بہ گاہ متعارف کرائیں۔

۲۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور بالخصوص سانحہ ۱۹۵۷ء کے بعد جماعت کی پالیسیاں Pragmatic بنیادوں پر مرتب کی جا رہی ہیں اور ان پالیسیوں کی اصولی حیثیت پر خاطر خواہ غور و فکر نہیں ہوتا۔ اس کی بھی سب سے بڑی وجہ ہماری پالیسی سازی کے عمل سے علما اور صوفیا کی بہ تدریج لاتعلقی ہے۔ مثلاً ۲۰۱۳ء کا انتخابی منشور مرتب کرنے والی سولہ رکنی کمیٹی میں صرف ایک عالم دین شامل تھا اور شنید ہے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہماری شہری اور صوبائی قیادت میں علما کا کردار نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے[1]۔ ہماری انتظامیہ سے علما کی یہ لاتعلقی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جماعتی زندگی سیکولر ہو رہی ہے[2] اور سیکولرائزیشن کے اس عمل کے فروغ کی بنیادی وجہ جماعت میں ماڈرنسٹ آدرشوں کا فروغ ہے۔ انھی ماڈرنسٹ آدرشوں نے ترکی کی

---

[1] Pragmatic اور Realistic پالیسیوں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ Realestic پالیسیاں وہ ہیں جو متعین اہداف کے حصول کے لیے موثر ترین ذرائع استعمال کریں۔ Pragmatic پالیسیاں وہ ہیں جن سے بہترین ممکنہ نتائج کے حصول کی بنیاد پر اہداف متعین کیے جائیں۔

[2] مولانا مودودی کے بعد کوئی عالم دین جماعت کا امیر نہ بنا اور مستقبل قریب میں کسی عالم دین کی جماعت کے امیر بننے کی کوئی توقع نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ADP اور تیونس کی اسلامی پارٹیوں کو سیکولرائز کیا اور آج جماعت کی شناخت اور وجود کو سب سے بڑا خطرہ ماڈرن ازم ہی سے ہے۔ ماڈرن ازم ہی ہمیں سرمایہ داری سے مصالحت پر راضی اور مجبور کر رہی ہے۔ علما سے مستقل مشاورت کے لیے ہمیں اپنے دستور میں ترمیم کر کے ایک ایسی مجلس علما تشکیل دینی چاہیے جو مختلف اسلامی جماعتوں کے قائدین اور ملک کے جید علما کرام پر مشتمل ہو اور جس میں تمام مکاتیب فکر دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی، شیعہ علما شامل ہوں۔ جماعت کی تمام پالیسیوں کی شرعی حیثیت کو یہ مجلس متعین کرے اور اس کی اجازت حاصل کیے بغیر ان پالیسوں کی تنفیذ ممکن نہ ہو۔ اس نوعیت کی ایک تجویز قاضی حسین احمد صاحب نے قیام ایم ایم اے کے وقت اس میں شامل تمام جماعتوں کو دی تھی جو منظور نہ ہو سکی۔

۳۔ اسلامی جماعتوں سے اشتراک عمل کو فروغ دے کر اوپر دی گئی تجاویز کے نفاذ کے نتیجے میں جماعت اس بات کو ممکن بنا سکے گی کہ محلّہ کی سطح ہر بین المسالک وفاق المساجد بہ تدریج قائم ہوں۔ ان وفاق المساجد کا دائرہ کار وسعت پذیر ہو اور دھیرے دھیرے یہ مندرجہ ذیل خدمات انجام دینے کے قابل بنائے جائیں:

۱۔ محلّہ میں مساجد اور مدارس کا تحفظ اور دہشت گردی سے ان کی حفاظت۔

۲۔ نظام افتا کا قیام اور تبلیغی اور محلّہ کی سطح پر رسوم اسلامی کی تنظیم و فروغ۔

۳۔ مقامی زبانوں میں اسلامی ادب کا فروغ اور اشاعت، خطبات تمام مقامی زبانوں میں ہوں فرقہ وارانہ مباحث سے پاک ہوں۔

۴۔ محلّہ کی سطح پر دارالقضا کا قیام اور پولیس اور مقامی انتظامیہ کے مقابلے میں مساجد کی عوامی نمایندگی کی حیثیت کو فروغ دینا تاکہ رفتہ رفتہ ہمارے قاضیوں کے فیصلوں کی تنفیذ عام ہو اور مساجد محلّہ اور بازار کی سطح پر متبادل انتظامی قوت کے سرچشمہ کے طور پر ابھریں۔[e]

۵۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیا اور مکانوں کے کرایے اور اسکول فیسوں کے تعین کے عمل میں ائمہ مساجد کے مصالحتی کردار کو فروغ دینا۔

ہم نے گزشتہ بیس پچیس سالوں میں رفاہی کاموں کا وسیع تجربہ حاصل کیا ہے لیکن

---

[d] اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہم ایسے زمانے میں ماڈرنائزیشن کے خوگر ہو رہے ہیں جب پوری دنیا میں ماڈرنائزیشن ایک فرسودہ نظریہ سمجھا جا رہا ہے، دیکھیے ہماری کتاب ''مغربی تہذیب ایک تنقیدی مطالعہ''۔

[e] کراچی میں ایم کیو ایم کے یونٹوں نے موثر طور پر یہ کر کے دکھایا ہے اور اس کے دور ابتلا میں ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۸ء تک یہ انتظامی شکست و ریخت سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میری رائے میں ہم اس سے وہ دعوتی اور سیاسی فائدہ نہ اٹھا سکے جو مصر اور شام میں الاخوان نے اٹھایا ہے۔ اس رائے کو ۲۰۱۳ء کے سندھ کے انتخابی نتائج سے تقویت ملتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے رفاہِ عامہ کے کام کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ یہ تشکیل نو مندرجہ ذیل اصولوں کی بنیاد پر کی جانی چاہیے:

۱۔ بیرونی امداد سے کلیتاً اعراض۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہ یہ مدد جاپان سے لی جائے کسی یورپی ممالک سے، سعودی عرب سے، امریکا سے یا اقوام متحدہ کے کسی ادارے سے ان تمام کے اکاؤنٹنگ اور رپورٹنگ طے ان ڈونر اداروں کی مدد شدہ اداروں کی گورننس اسٹرکچر میں شمولیت کے لیے ہی وضع کیے جاتے ہیں اور ان اداروں سے مالی مدد لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے انسپکٹرز کو رفاہی ادارے کی پالیسی سازی میں شراکت دی جائے[1] اگر کوئی ڈونر ایجنسی بغیر کسی Reporting Obligation یک مشت تمام گرانٹ (قرضہ نہیں) دے دے تو اس کو قبول کرنے میں مضائقہ نہیں بہ شرط کہ وہ ڈونر ایجنسی حربی کفار کی حلیف نہ ہو۔

۲۔ رفاہی کام کو محلے میں جاری دعوتی کام سے متعلق کیا جائے۔ ہمارے رفاہِ عام کے کام کا انتظامی محور و مرکز علاقہ کی مساجد ہوں۔ رفاہِ عامہ کی تنظیموں کے تمام کل وقتی کارکن لازماً کسی نہ کسی راسخ العقیدہ اسلامی تنظیم کے وابستگان ہوں ائمہ مساجد کو انتظامی ذمہ داریاں سونپنے میں فوقیت دی جائے۔

۳۔ امداد اور سہولیات کی تقسیم میں تحریکات اسلامی کے کارکنان کو ترجیح دی جائے اور ہر Beneficiary کا ضامن ایک تحریکات اسلامی سے وابستہ فرد ہو۔ تعلیم، صحت اور تعمیراتی سہولیات کی فراہمی تحریکات اسلامی کے کارکنوں اور ان کے وابستگان تک محدود ہوں۔

۴۔ قدرتی آفات سے بچاؤ کا کام عمومی ہو لیکن rehabilitation کے کام کو محدود کر کے دین دار طبقات تک محدود کیا جائے۔ سندھ میں ہمارے ۲۰۱۰ء کے تعمیر شدہ مکانات پر اب پی پی پی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں اور ہمارے تعمیر شدہ اسکولوں میں دہریوں کو با آسانی اساتذہ کے طور پر ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔

۵۔ مراعات یافتگان کو مساجد کی بنیاد پر منظم کیا جائے اور ان کو دعوتی سرگرمیوں سے

---

[1] میں خود تقریباً چھے سال DFID میں اقوام متحدہ کے ایک نمایندہ کے طور پر منسلک رہا ہوں اور میرا مشاہدہ ہے کہ چین تک میں یہ ادارے اپنی امداد کے ذریعے اپنا اداراتی استحکام قائم کر لیتے ہیں اور ان کی امدادی سرگرمیاں تخریب کاری کو فروغ دینے کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وابستہ کیا جائے۔ مراعات یافتگان کی تنظیموں کو رفاہِ عامہ کی تنظیموں سے منسلک کیا جائے اور رفاہِ عامہ کے اداروں کی پالیسی سازی میں ان کا ایک کردار تسلیم کیا جائے۔

سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا محور اور مرکز مارکیٹ ہے۔ سرمایہ دارانہ عمل کا فروغ اور مارکیٹ کا معاشرے پر تسلط ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ بالخصوص فنانشل مارکیٹوں کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام ملکیت قائم ہوتا ہے۔ اس نظم ملکیت کو کارپوریٹ ملکیت کہتے ہیں[1]۔ جب معاشرے پر کارپوریٹ پراپرٹی غالب آجائے تو ہر شخص کیا مزدور، کیا مینجر، کیا شیئر ہولڈر، کیا ریاستی منتظم سرمایہ کا آلہ کار بن جاتا ہے اور ہر ایک کی آمدنی کا انحصار اجرت اور سرمایہ کی بڑھوتری کے گردشی نظام سے وابستہ ہو جاتی ہے[2] الحمدللہ ابھی سرمایہ کی گرفت پاکستانی معیشت پر کم زور ہے۔ نوے فی صد کاروبار غیر کارپوریٹ (یعنی پرائیویٹ) اور حلال ہے۔ اس کا سود کے مارکیٹ سے کوئی تعلق ہے نہ سٹہ کی مارکیٹ سے۔ پاکستان کی معیشت کے ایک بڑے حصے پر ابھی فنانس کی گرفت مستحکم نہیں ہے۔ اسّی فی صد آبادی کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں اور اجرتی مزدور لیبر فورس کا ایک تہائی ہیں ان حالات میں اسلامی کاروبار کو فروغ دینا ایک آسان کام ہے۔ وسیع پیمانے پر بچتوں کو ملک بھر میں پھیلے ہوئے مساجد و مدارس کے نیٹ ورک کے ذریعے جمع کیا جاسکتا ہے اور ایک مرکزی تمویلی ادارے کی نگرانی میں یہ رقومات مضاربہ اور مشارکہ معاہدوں کی بنیاد پر اہل دین کے کاروبار میں لگائی جاسکتی ہیں۔ اس نوعیت کی ایک اسکیم کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ معاشیات میں تیار کی گئی ہے[3] اور اس کو محترم امیر جماعت کی خدمت میں بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ اس تجویز کی تنفیذ کی رکاوٹیں دور کی جائیں تاکہ تحریکات اسلامی کے کارکن سرمایہ دارانہ معیشت کی اجرتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوسکیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پاکستانی معاشرت کو ماڈرن ازم اور سرمایہ داری سے محفوظ رکھنے والی سب سے اہم معاشرتی قوت برادری، قبیلہ اور مشترکہ خاندانی نظام ہے۔ یہی وہ اجتماعیت ہے جو اسلامی رسوم اور اسلامی اقدار کی فطری معاشرتی محافظ اور ضامن ہے۔ جیسا کہ Antole Lieven نے اپنی کتاب Pakistan: A Hard Country میں تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ برادری اور مشترکہ خاندانی نظام کی مرکزیت اور فعالیت پاکستانی دیہی علاقوں تک محدود

---

[1] کارپوریٹ نظم ملکیت اور ریاستی ملکیت یہ دونوں ذاتی ملکیت کو ختم کردیتی ہیں۔

[2] تفصیل اس اجمال کی ہماری کتاب ''سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ'' میں دیکھیں۔

[3] یونس قادری کا مقالہ ''اسلامی بینکوں کا متبادل: اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کی عملی تجویز''

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں اس معاشرتی ادارے نے شہری علاقوں میں بھی اپنا نفوذ اور اثر قائم کیا اور سوائے اردو بولنے والی آبادیوں کے[1] ہر کمیونٹی میں برادری اور مشترکہ خاندان ہی بنیادی معاشرتی اکائی ہے اور اجتماعی فیصلوں کی تشکیل اور تنظیم میں برادریاں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ ان برادریوں اور قبائل کی فطری تاریخی شناخت مذہبی ہے۔ اس مذہبی شناخت کو سیکولر رجحانات نے مجروح کیا لیکن قبائل اور برادریوں اور مشترکہ خاندانوں کی نجی اندرونی معاشرت پر مذہبی ثقافت ہی غالب ہے۔ بہ حیثیت ایک انقلابی قوت ہمیں اس فطری مذہبی معاشرتی صف بندی کو ایک سیاسی قوت کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ چوں کہ ہم ماڈرن ازم سے متاثر ہیں لہٰذا یہ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور سیکولر ماڈرنسٹوں کی طرح ہم بھی برادری کی بنیاد پر قائم معاشرتی صف بندی کو اپنے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ ہم یہ بات فراموش کر گئے کہ قبیلہ اور برادری اپنی اصل میں ایک اسلامی معاشرتی ادارہ ہے اور جس مذہبیت کا اظہار برادری اور مشترکہ خاندان کی روزمرہ کی نجی زندگی میں ہوتا ہے اس مذہبیت کا اظہار قبیلہ اور خاندان کے خارجی معاشرتی تعلقات اور اقدامات میں بھی کروایا جاسکتا ہے۔ جہاد افغانستان اور انقلاب ایران، نائیجیریا، مالی اور یمن میں مجاہدین کی تحریک کا تسلسل اسی وجہ سے قائم ہے کہ ان اسلامی تحاریک نے مقامی شعوب و قبائل کے خارجی تعلقاتی نظام کو متاثر کیا اور یہی کام یا بی دیر پا انقلابی جدوجہد کو Sustain کر رہی ہے۔[2]

لیکن قبائلی داخلی مذہبیت کو ان کی خارجی معاشرتی اور ریاستی اقدامات میں سمونا اور اس مذہبی عصبیت کا اظہار قبائل اور برادریوں کے ریاستی اقدامات میں ممکن بنانا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم برادریوں اور قبائل کی داخلی معاشرت اور خاندانی ثقافت سے واقف ہوں اور ان بزرگوں اور خاندانی سربراہوں کا اعتماد حاصل کریں جو خاندانی اور برادری کی داخلی معاشرت میں اسلامی عصبیت کو غالب رکھنے میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان قبائلی اور خاندانی بزرگوں کی معاشرتی قوت کو مستحکم کیے بغیر ہم برادریوں کی

---

[1] جو فلسطینیوں اور آرمینائی اور تبتی جلاوطنوں کی طرح ہیں اور جن کی شناختی جڑیں تقریباً کلیتاً منہدم کر دی گئی ہیں۔

[2] سید بادشاہ کی تحریک کی پسپائی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ ہندستانی مجاہدین پٹھان قبائل سے اپنی معاشرتی اجنبیت ختم نہ کر سکے اور شریعت اور ''پختونوں والی'' میں تضادات کو ختم کرنے کی کوئی منظم کوشش نہ کی گئی ہماری طرح تحریک مجاہدین اور صادق پوری علما کی تحاریک کی بھی کوئی معاشرتی حکمت عملی نظر نہیں آتی۔ حضرت جعفر تھانوی نے اس کا اقرار کیا ہے۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

سماجی قوت کو تحفظ اور غلبہ دین کے لیے استعمال نہ کرسکیں گے۔ ہمیں اس چیز کا شعور نہیں کہ جیسے جیسے برادریوں اور خاندانوں کی معاشرتی اور ریاستی گرفت کم زور ہوگی ویسے ویسے سرمایہ دارانہ انفرادیت فروغ پائے گی۔ حقوق کی سیاست عام ہوگی اور لبرل اور موڈرنسٹ آدرش مانوس اور معقول گردانے جائیں گے۔ اگر معاشرہ اور ریاست ماڈرنائز ہوگئے تو لازماً اسلام ماڈرنسٹ اور سرمایہ دارانہ اہداف آزادی، مساوات اور ترقی کے حقوق کا ایک ذریعہ بن جائے گا اور مولانا مودودی کے اجتہاد ''اسلام ایک مکمل اور خود کفیل ضابطہ حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' لغو اور بے معنی ہوکے رہ جائیں گے۔

جماعت اسلامی کے وجود اور اس کی شناخت کو سب سے بڑا خطرہ ماڈرن ازم سے ہے۔ ہم اسی راہ پر گام زن ہیں جو ترکی کی AKD اور تیونس اور مراکش کی حکومتی اسلامی جماعتوں نے اختیار کی ہے۔ جماعتی تحقیقی ادارہ، اسلام آباد میں IPS اور کراچی اور لاہور کی اکیڈمیاں، وہ مواد فراہم نہیں کر رہے جو سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے اسلامی انہدام کے لیے ضروری ہیں۔ ان اداروں کی زیادہ تر تصنیفات یا تو دعوتی اور سوانحاتی نوعیت کی ہوتی ہیں یا ان کا تعلق ملک کی خارجہ پالیسی، میکرو اکنامک پالیسیوں اور عمومی ثقافتی مسائل سے ہوتا ہے۔ ان کا تخاطب عام پڑھے لکھے شہری سے ہوتا ہے۔ ان تصنیفات کو جماعت کی قیادت اپنی معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی مرتب کرنے میں استعمال نہیں کرسکتی[1] اگر ہمیں ملک میں اپنی معاشرتی اور ریاستی جڑیں مضبوط کرنا ہیں تو ہمیں ethonographic microsociological, تحقیق کی شدید ضرورت ہے۔ اس psychogocial اور demographic، micro economic کام پر سرحد اور کراچی میں خصوصی طور پر توجہ دینا چاہیے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انفرادی شناخت، معاشرتی رجحانات اور ریاستی تحکم کے مقبول عام جواز میں جو تغیر آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے اور محرکات کیا ہیں۔ اس مواد کی بنیاد پر ہی ہم رد سرمایہ داریت کی ایک موثر معاشرتی اور ریاستی حکمت عملی ترتیب دے سکیں گے۔

ہماری ریاستی جدوجہد کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کی تسخیر ہونا چاہیے۔ اس جدوجہد کا مقصد سرمایہ دارنہ عدل کا قیام نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کا ذریعہ بنے تو ہم سرمایہ داری کی اسلام کاری کر کے مولانا مودودی کے دو کلیدی اجتہادات ''اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام زندگی ہے اور مغربی تہذیب جاہلیت خالصہ ہے'' کی لازماً

---

[1] یہی بات جناب اعجاز تقی گیلانی کے ادارے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے لیکن PIPO سے گیلپ پاکستان بننے کے بعد اس ادارے پر امریکا کا مکمل قبضہ ہوگیا ہے جب کہ IPS اور اکیڈمیاں اب بھی ہماری ہیں۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

تردید کریں گے اور جماعت کا وجود ختم ہو جائے گا ہم اس ملک کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی نہیں بن سکتے کیوں کہ پاکستان کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی تحریک انصاف ہے۔ عوام کی نظر میں تحریک انصاف کا سرمایہ داری سے اخلاص معتبر ہے کیوں کہ تحریک انصاف ترکی کی AKD کی طرح ایک سیکولر جماعت ہے اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی سیکولر انفرادیت، معاشرت اور تنظیم اقتدار کا دوسرا نام ہے۔ عوام کی نظر میں ہمارا سرمایہ دارانہ اخلاص معتبر نہیں کیوں کہ ہم ایک مذہبی جماعت ہیں۔ عمران خان ہم کو اپنی بی ٹیم کے طور پر قبول کرنے پر تیار ہے جیسے ضیاء الحق ۱۹۷۸ء اور نواز شریف ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۱ء میں ہم کو اپنی بی ٹیم کے طور پر قبول کرنے کو تیار تھے کیوں کہ عمران، ضیاء اور نواز کی توقع یہ ہے کہ سرمایہ داری کی اسلامی کاری سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے لیکن فوج، مسلم لیگ اور تحریک انصاف کی بی ٹیم بن کر ہم اپنی مذہبی شناخت کو بے اندازہ نقصان پہنچاتے ہیں اور اس حیثیت کو قبول کرنے کے نتیجے میں ہمارے فعال ترین کارکنوں کی مذہبیت شدید طور پر متاثر ہوتی ہے اور وہ بی ٹیم چھوڑ کر اے ٹیم میں داخل ہو جاتے ہیں یہی آج پاسبان کی تنظیم کر رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میری رائے میں سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کا عمل سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار نظر انداز کرنے کی روش جیسی کہ تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی نے اپنائی ہوئی ہے، سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار یعنی سرمایہ دارانہ ریاست کا محض ایک جزو سرمایہ دارانہ حکومت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کے دیگر اداروں پولیس، انتظامیہ، فوج، میڈیا، عدلیہ، اشرافیہ کی صف بندیاں، بین الاقوامی ایجنسیاں ہیں[1] محض حکومت کی تبدیلی سے ریاستی نظام تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ ریاست میں ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ یہی ترکی، مصر، تیونس، مراکش میں ہو رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ حکومت کی یہ استعداد کہ وہ فوج، پولیس، سول انتظامیہ، میڈیا، عدلیہ، بین الاقوامی ایجنسیوں[2] کی ترجیحات اور عملی طریقہ کار کو تبدیل کر سکے، نہایت محدود ہوتی ہے اور ہمیں اس کا تجربہ وفاق کی سطح پر ۱۹۷۸ء اور پختون خوا کی سطح پر ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۲ء کے دور میں خوب ہو چکا ہے۔

لہٰذا اگر ایک مستحکم اسلامی ریاست تعمیر کرنا ہے تو حکومت کے قیام کی جستجو اسلامی نظام اقتدار کے قیام کی جستجو کا ایک جزو ہونا چاہیے۔ یہی حکمت عملی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] اس کی تفصیل ہماری کتاب ''جمہوریت: ایک اسلامی تجزیہ'' میں پیش کی گئی ہے۔

[2] NATO، IMF، WTO، FSF، World Bank، Rating Agencies وغیرہ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکہ میں اپنائی جہاں آپ نے مسلمانوں کے لیے ایک state within a state قائم کی جو مکہ کے دارالندوہ پر انحصار نہیں کرتی تھی بل کہ جس کی اپنی عدلیہ، انتظامیہ اور نظام اشاعت اور تبلیغ موجود تھا[1] یہ سرکاری نظام سے علی الرغم اقتداری صف بندی Micro-political سطح پر کی جاتی ہے اور عوامی سطح پر ایسے ادارے قائم کیے جاتے ہیں جن کی طرف سرکاری انتظامیہ اور عدلیہ سے اقتدار منتقل کیا جاسکے۔ علمائے ایران نے محلّہ اور بازار کی سطح پر نظام افتا اور قضا کو مستحکم کر کے ہی شاہی انتظامیہ اور فوج کے اقتدار اور تحکم کو مفلوج کیا اور امریکی تسلط کو ایران سے بے دخل کرنے میں کام یابی حاصل کی۔

ہماری سیاسی جدوجہد کا بنیادی مقصد سرمایہ دارانہ عدل کا فروغ نہیں بل کہ اسلامی عوامی ادارتی صف بندی کا استحکام اور فروغ ہونا چاہیے۔ علما کی جدوجہد کے نتیجے میں آج پورے پاکستان میں تقریباً ایک لاکھ سترہ ہزار مساجد اور مدارس کا وسیع نیٹ ورک موجود ہے اور علما کی جماعتیں بالخصوص جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان اس بات میں بڑی حد تک کام یاب ہیں کہ اس دینی نیٹ ورک کو ریاستی دست برد سے محفوظ رکھ سکیں۔ یہ ایک نہایت قابل قدر کارنامہ ہے کیوں کہ امریکی اور یورپی استعمار کی یہ بھرپور کوشش ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم اور تربیت کو اپنے زیر اثر لا کر سیکولرائز اور ماڈرنائز کر دے۔ جماعت اسلامی کی ریاستی جدوجہد کا اولین مقصد مدارس اور مساجد کا تحفظ اور ان کی ادارتی خود انحصاریت کا فروغ ہونا چاہیے اس سے زیادہ اور کوئی چیز اہم نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ مدارس اور مساجد کے محلّہ اور بازار کی سطح پر اقتدار کو مستحکم کرنے اور فروغ دینے کی جدوجہد اور اپنی ریاستی جدوجہد سے اقتدار کو سرمایہ دارانہ عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا سے مساجد اور مدارس کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ بنائیں[2]۔ یہی اسلامی انقلابی حکمت عملی ہے۔

ہماری ریاستی حکمت عملی کا ایک اہم جزو استعمار مخالفت بھی ہونا چاہیے۔ پاکستان ایک استعماری باج گزار ریاست ہے اور سعودی اور امریکی اشارے پر ہی یہاں حکومتیں بنتی اور کام کرتی ہیں۔ یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ ہمارے سابق امیر سید منور حسن نے حلف اٹھاتے ہی ایک ملک گیر امریکا مخالف تحریک کا انعقاد کیا لیکن یہ تحریک ناکام ہوگئی اور ہم ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کوئی موثر امریکا مخالف اتحاد نہ بنا سکے اور گو امریکا گو تحریک میں پاکستانی عوام نے ہمارے کارکن کا ساتھ نہ دیا۔ پاکستان میں امریکی مخالفت اور نفرت عام ہے کئی عالمی رویوں

---

[1] اس کی تفصیل ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب ''خطبات بہاول پور'' میں صفحہ ۱۵۱-۱۷۰ پر پیش کی گئی ہے۔

[2] اس کی تفصیل ہماری کتاب ''جمہوریت یا اسلام'' میں پیش کی گئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور رپورٹوں سے یہ بات واضح ہے لیکن اس نفرت کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے محرکات کیا ہیں؟ کن ایشوز پر اس عوامی نفرت کو Mobilise کیا جاسکتا ہے اور کیسے؟ کون سے معاشرتی عناصر امریکی استعمار کی مخالفت میں سب سے آگے جانے کو تیار ہیں۔ ہمارے پاس ان سوالات کے کوئی جواب موجود نہیں کیوں کہ IPS اور ہماری اکیڈمیوں نے وہ Micro Sociological اور ethnographic تجزیے نہیں کیے جن کی بنیاد پر عوامی امریکی مخالفت کی نوعیت اور پاکستان میں امریکی معاشرتی اقدامات کے فوائد و نقصانات کی گروہی تقسیم متعین کی جاسکے۔ ہم نے گو امریکا گو کی تحریک بغیر کسی ہوم ورک کے چلا دی اور اس کو relevent issues پر Focus نہ کر سکے۔❶

پچھلے دس سال سے IPS کی کوششوں کے نتیجے میں ہم پاکستان میں سب سے زیادہ چین نواز جماعت بن گئے ہیں اور ہم نے باقاعدہ ایک دستاویز میں اس بات کو قبول کیا ہے کہ سنکیانگ اور گانزو کا جہاد چین کا داخلی معاملہ ہے۔ پاکستان کے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے ہم نے مجاہدین سنکیانگ اور گانزو کے ساتھ نہ دے کر ان کو تنہا چھوڑ دیا ہے آج جماعت اسلامی پورے عالم اسلام میں مجاہدین کی قیادت سے پیچھے ہٹ رہی ہے علاقے میں امریکا کا نظریاتی حریف ایران ہے چین نہیں۔ ایران پر امریکا ہر قسم کی مالی پابندیاں عائد کیے ہوئے ہے اس کے برعکس چین نے کھربوں ڈالر کی امریکی Treasury securities خرید رکھی ہیں جو امریکی معیشت کو استحکام پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ۱۹۵۲ء کی کوریائی جنگ کے بعد سے آج تک چین نے امریکا سے نبرد آزمائی نہیں کی نہ ویت نام میں، نہ کمبوڈیا میں، نہ فلسطین میں، نہ لبنان میں، نہ عراق میں، نہ بنگلہ دیش میں، نہ افغانستان میں، نہ انگولا میں، نہ موزمبیق میں، نہ برما میں، اس کے برعکس اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سے آج تک ایران نے امریکی استعمار کی بھرپور مخالفت کی ہے اس کے باوجود پچھلی دہائیوں میں جماعت اسلامی اور ایرانی قیادت میں فاصلے بڑھے ہیں۔ پاکستان کی غلبہ دین کی تحریک کو ایران کا فطری حلیف اور ہم نوا ہونا چاہیے دونوں ملکوں کے confediration کے قیام اور دونوں ملکوں کے نیوکلیئر پروگرام سے غلبہ دین کی تحریک کو فائدہ ہوگا۔

---

❶ تحقیقی کام کا یہی فقدان ہماری داخلی سیاسی ناکامی کا بھی ایک اہم سبب ہے۔ آج سے پچیس سال قبل ایم کیو ایم نے ہم کو کراچی کی سیاست سے بے دخل کیا تھا لیکن اسلامک ریسرچ اکیڈمی ایم کیو ایم کے ادارتی اقتدار کی ترتیب کا ایک بھی تجزیہ مرتب نہ کر سکی اور نہ اس کی ضرورت کبھی محسوس کی گئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تجاویز کا خلاصہ

اب میں تجاویز کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ اس حکمت عملی کا مقصد جماعت اسلامی پاکستان کا تمام راسخ العقیدہ گروہوں میں رابطہ قائم کر کے اپنے دائرہ کار میں وسعت اور دوام پیدا کرنا ہے۔

۲۔ جماعت کے دعوتی کام کو مزکی اور مبلغ گروہوں کے کام میں ضم کر کے ان گروہوں کے متعلقین کو مولانا مودودی کے دو بنیادی اجتہادات اسلام ''ایک مکمل خود انحصاری نظام زندگی ہے اور مغربی بربریت جاہلیت خالصہ ہے'' کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

۳۔ دستور میں ترمیم کے ذریعے ایک سپریم علما کونسل قائم کی جائے جس میں ملک کے تمام راسخ العقیدہ مکاتیب فکر کے جید علما شامل ہوں۔ جماعت کے پالیسی اقدامات کی شرعی تصدیق کرنا کونسل کی ذمہ داری ہو۔

۴۔ جماعت کے پالیسی ساز اداروں اور انتظامیہ میں علما کی تعداد کو بڑھایا جائے۔ شورا اور عاملہ میں کم از کم ایک تہائی نمایندگی علما کی ہو۔ یہ جماعت کو ماڈرن ازم سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے۔

۵۔ محلہ کی سطح پر بین المسالک مسجدوں کے وفاق کے قیام کی جدوجہد، ان میں نظام افتا کا قیام اور ان نظاموں کی تنفیذ اور دفاع کا بندوبست، یہ وفاق بازاروں میں تعین قیمت اور سول انتظامیہ کے فیصلوں کی تنفیذ کے عمل میں علما کرام کی عوامی قائدانہ حیثیت کو مستحکم کرنے کا آلہ کار ہوں۔

۶۔ رفاہِ عامہ کے کام کو مزکی اور مبلغ جماعتوں کے کام سے مربوط کیا جائے۔ بین الاقوامی donor agencies سے Funding نہ لی جائے Beneficries کا دائرہ تحریکات اسلامی کے کارکنوں تک محدود کیا جائے، Beneficries کی جماعت سے متعلق ادارتی صف بندی کی جائے۔ رفاہِ عامہ کے کام کی توسیع کا ایک اہم مقصد تحریکات اسلامی کے کارکنان کو ملازمتیں فراہم کرنا ہو۔ قدرتی آفات سے بچاؤ کا کام عمومی ہو۔

۷۔ اسلامی کاروبار کو ملکی سطح پر فروغ دینے کے جماعتی نظم میں ایک مرکزی تمویلی ادارہ کا قیام جو تحریکات اسلامی سے مسجدوں اور مدرسوں کے ذریعے رقومات جمع کر کے ان کو منافع بخش کاروبار میں مشارکت اور مضاربت کے تحت استعمال کرے۔

۸۔ قبائلی، برداری اور مشترکہ خاندانی نظام میں دخول کی کوشش پر خاندانی برادری اجتماعیت کے بزرگوں اور دین دار افراد سے مستقل ادارتی رابطہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۹۔ ہمارے تحقیقی ادارے میکرو سطح کی عمومی تحقیق کے بجائے ایسے Micro-sociological، Ethnographic اور Micro economic تجزیات تیار کرسکیں جو جماعت کو معیشت اور معاشرت کی بنیادی ساخت (Mass Base and Micro Structure) سے روشناس کرائے۔ تحقیقی ادارہ جو مواد تیار کریں وہ دعوتی یا عمومی نوعیت کا نہ ہو بل کہ اس کے مخاطبین جماعت اور تحریکات اسلامی کے پالیسی ساز افراد ہوں اور اس کا مقصد ہماری معاشرتی اور ریاستی گرفت کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ ہو۔

۱۰۔ سیاسی جدوجہد کا مقصد سرمایہ دارانہ عدل کی فراہمی نہیں بل کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا انہدام ہو۔ سیاسی پیش رفت کا اولین مقصد مساجد و مدارس کے نظام کو ریاستی اور استعماری دخول اور دست برد سے محفوظ رکھنا ہونا چاہیے۔

۱۱۔ سیاسی جدوجہد کا مقصد ریاستی ذرائع کے استعمال کے ذریعے معاشرتی سطح پر انقلابی ادارتی صف بندی کو ممکن بنانا ہے تاکہ ''مکہ کے ماڈل'' پر مبنی ہم ایک state within a state تعمیر کرسکیں اور اقتدار کو سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں سے منتقل کر کے اسلامی تنظیم تحکم میں مرتکز کرسکیں۔ یہ اسلامی اقتداری نیوکلس وہی محلہ کی سطح پر قائم بین المسالک وفاق المساجد ہوسکتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ انتخابات اسمبلیوں اور حکومتوں میں شرکت کے ذریعے ہم کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ سیاسی تنظیمی اقتدار سرمایہ دارانہ انتظامیہ اور عدلیہ کے اداروں سے بین المسالک وفاق المساجد کی طرف منتقل ہو جائے۔

۱۲۔ سرمایہ دارانہ سیاسی عمل میں شرکت کا اہم مقصد ملک پر استعماری گرفت کو کم زور کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی امریکا مخالف تحریک کو زمینی حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ازسرنو مرتب کریں، چین نوازی کو ترک کریں، ایران سے اپنے تعلقات بحال کریں اور پاکستان اور ایران کی کنفیڈریشن کے قیام کی عوامی وکالت کریں اس Confideration میں افغانستان کی شمولیت کی بھی وکالت کریں۔

ہم نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات ایک موڈرنسٹ اسلامی ری وژنسٹ ایجنڈے پر لڑے اور ہمارا بنیادی مقدمہ یہ تھا کہ ہم سرمایہ دارانہ عدل (جس کو ہمارا منشور اسلامی عدل ہی گردانتا ہے) کے قیام کی جدوجہد کے سب سے مخلص اور محنتی کارکن ثابت ہوں گے۔ اس ایجنڈے کی بنیاد پر ہم کو سرحد میں جزوی کام یابی حاصل ہوئی[o]۔ پختون خوا میں تحریک انصاف کو بھی اسی ایجنڈے کی بنیاد پر کام یابی ملی ہے اور صوبائی اسمبلی میں ان کے ارکان کی تعداد ہم سے کئی گنا

o ہمارے پختون خوا کی اسمبلی میں ۲۰۰۲ء میں ۱۹۷۰ء سے بہت زیادہ ارکان منتخب ہوئے تھے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زیادہ ہے۔ ہم تحریک انصاف سے اشتراک کر کے پختون خوا کی صوبائی حکومت میں شامل ہیں۔ تحریک انصاف ایک سیکولر اور مسلم قوم پرست جماعت ہے اور اس نے امریکا میں اپنی ساکھ محفوظ رکھنے اور اپنے سیکولر شناخت کو اجاگر کرنے کے لیے ہی ہمارے ساتھ سیٹ ایڈجسٹمنٹ سے انکار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم نے انتخابات حکومت بنانے کے لیے ہی لڑے تھے اور اگر ہم ایجنڈے کی مماثلت کی بنیاد پر تحریک انصاف سے مل کر حکومت بناتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ہمیں اس عمل کے ممکنہ نقصانات اور فوائد پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ تحریک انصاف ایک کم زور جماعت ہے۔ اس کے بہت سے منتخب نمایندگان صوبائی اسمبلی میں اور قومی اسمبلی میں بھی مشرف کے ساتھی تھے یہ وہ لوگ ہیں جنھیں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ سے ٹکٹ نہیں ملے۔ کچھ نئے چہرے قومی اور پختون خوا اسمبلیوں میں ضرور پہنچے ہیں لیکن یہ ''موروثی'' نئے چہرے ہیں۔ قومی اسمبلی میں تحریک انصاف پارٹی کے غیر موروثی نئے چہرے چونتیس میں سے صرف چار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے سیاست دانوں نے عمران خان کی مقبولیت اور عوامیت کو اپنے حق میں کیش کرایا ہے۔ یہ پیشہ ور سیاست دان تحریک انصاف پر چھا گئے ہیں اور ان میں آپس کی مفادات کی جنگ اپنے عروج پر ہے اور عمران خان کے لیے اپنے سوشل ڈیموکریٹ ایجنڈے پر عمل کر کے سرمایہ دارانہ عدل قائم کرنا کٹھن ثابت ہوگا۔ اس کا قوی امکان موجود ہے کہ اے این پی اور ایم ایم اے کی حکومتوں کی طرح، IQVI، JI کی حکومت بھی پختون خوا کی عوامی توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہے اور طرز حکم رانی میں بھی قابل ملاحظہ تبدیلی نہ ہو سکے۔ پختون خوا میں ایک نسبتاً طاقت ور حزب اختلاف بھی موجود ہے جو حکومت بنانے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ یہ حزب اختلاف عمران خان کے ساتھیوں کو توڑنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں اور ان روایتی سیاست دانوں کو ساتھ رکھنے کے لیے عمران خان کو سوشل ڈیموکریٹ پالیسیوں کی تنفیذ میں سست روش اختیار کرنا پڑے گی۔

یہ عین ممکن ہے کہ عمران خان پختون خوا میں سرمایہ دارانہ عدل کو فروغ دینے میں خاطر خواہ پیش رفت نہ کر سکے۔ لیکن تحریک انصاف کی حکومت صوبہ میں قیام امن کے ضمن میں مثبت اقدامات کر سکتی ہے۔ اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عمران خان اور پاکستانی فوج جان لے کہ ۲۰۰۲ء کی طرح ۲۰۱۳ء کے انتخابات بھی خیبر پختون خوا میں مجاہدین اسلام نے جیتے ہیں اور انھی کی کام یابی کو پہلے ایم ایم اے اور اب عمران خان نے کیش کروایا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ مجاہدین اسلام نے دیہی اور سرحدی پختون خوا میں جو انتظامی اقتدار مستحکم کیا ہے اس کو منتشر کرنا عمران خان کے بس کی بات ہے نہ فوج کی۔ مجاہدین اسلام نے ان علاقوں میں خوانین اور ملک کے ماتحت جو نیوکالونیل نظام اقتدار ۱۹۳۰ء کی دہائی سے قائم کیا گیا تھا اس کو تقریباً مکمل طور پر منشر کر دیا ہے اور علاقائی اقتدار اخوند اور ملا کی طرف منتقل کر کے شریعت کا نفاذ عملاً کر دیا ہے۔ ''مکہ ماڈل'' پر عمل کر کے پختون خوا کے ان علاقوں میں مجاہدین اسلام نے ایک "State within a state" قائم کر دی ہے اور اس نوعیت کی Mezzanine ریاستیں پورے عالم اسلام میں ابھر رہی ہیں اور کہیں بھی ان کو استعماری فوج کشی کے ذریعے منتشر نہیں کیا جاسکتا۔ اس استعمازی ناکامی کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ ٹیکنالوجیکل ہے۔ موجودہ جنگی ٹیکنالوجی زمینی قبضہ قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ نظریہ کی سطح پر یہ ٹیکنالوجی بھی پوسٹ ماڈرنسٹ ہوگئی ہے یہ ''ورچوئل ٹیکنالوجی'' تخریب تو کرسکتی ہے لیکن تعمیر نہیں کرسکتی۔ یہ بات لبنان، افغانستان، شام، عراق اور مالی کی جنگوں سے ثابت ہے اور ان محاذوں سے اس ٹیکنالوجی کے مالکوں کو فرار کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں نظر آتا۔

دوسری وجہ نظریاتی ہے آج ماڈرنسٹ آدرش لایعنی، نامعقول اور فرسودہ ثابت ہوگئے ہیں جو علاقے اور شعبہ ہائے زندگی سرمایہ کی گرفت سے باہر ہیں وہاں سرمایہ دارانہ نظریات کو قبولیت عامہ دلانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے کیوں کہ حرص وہوس (قوم پرستی، لبرل ازم یا سوشل ازم کی شکل میں) کو فروغ دینے کے لیے جس ثقافتی تناظر کی ضرورت ہے وہ ان mezzanine ریاستوں میں پیدا نہیں کیا جاسکتا[1] لیکن اگر mezzanine ریاستوں کی بالادست قیادت خود ہی استعماری قدروں (جمہوریت، آزادی، مساوات، ترقی) کو قبول کرلے تو mezzanine ریاستوں کو سرمایہ کے چکر میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مجاہدین اسلام کی اصل سیاسی قوت اسی بات میں ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظریات، قوم پرستی، لبرل ازم، سوشل ازم اور سرمایہ دارانہ اقدار، آزادی اور ترقی کو رد کر دیتے ہیں۔

مجاہدین اسلام سمجھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین خلیفہ تغلب اور سلطان عادل ہیں اور شرع اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی اس حیثیت کو ترک کریں[2]۔ لہٰذا مجاہدین اسلام

---

[1] تفصیل اس اجمال کی Foreign Affairs میں ۲۰۱۱ء میں شائع ایک مضمون میں دی گئی جس نے جنوبی لبنان، افغانستان، عراق، صومالیہ، مالی نائیجیریا اور یمن کو Mezzanine کے طور پر شمار کیا اور کہا ہے کہ ان علاقوں سے جلد از جلد نکل جانا امریکا کا واحد آپشن ہے۔

[2] ملا یونس اخوندزادہ واقعہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ دلیل دیتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خوانین اور ملائک کے اقتدار میں سیکولر ریاستی انتظامی استبداد کو قبول کرلیں محض جنگ کو طول دینا ہے اور امریکا کے متوقع افغان انخلا کے بعد پاکستان کو اپنے فطری عسکری حلیفوں سے محروم کرنے کی حکمت عملی ہے۔ عمران خان کے بالخصوص ریٹائرڈ فوجی افسروں سے مضبوط تعلقات ہیں۔ ان کو فوج کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ مجاہدین اسلام سے محاذ آرائی ختم کرے، خوانین اور ملکوں کے نظام اقتدار دوبارہ قائم کرنے کی جستجو نہ کرے۔ مجاہدین کو اس بات پر آمادہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنا دائرہ کار سرمایہ دارانہ مراکز تک وسیع نہیں کرسکتے اور اس نوعیت کی پیش رفت سے غلبہ دین کی جدوجہد کو عوامی حمایت سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی کو کوشش کرنا چاہیے کہ عمران خان اور مجاہدین اس بنیاد پر سمجھوتا کرلیں اور اس کی عملی تنفیذ کریں۔

جہاں تک تحریک انصاف کا ڈویلپمنٹ ایجنڈا ہے تو اس میں سب سے بڑی رکاوٹ تحریک کی اپنی زبوں حالی ہے، جس شخص کو عمران خان نے پختون خوا کا اپنے صوبائی صدر کی جگہ وزیر اعلا بنایا ہے وہ علاقے کا مشہور بدمعاش پرویز خٹک ہے۔ اس کے مشرف سے بہترین تعلقات تھے، شیر پاؤ کی پیپلز پارٹی میں تھا، ق لیگ میں بھی شامل تھا اور صوبائی وزیر بھی سیاسی جوڑتوڑ سے بنا۔ یہ اپنے جیسے بدمعاشوں کو ہی تحریک انصاف کے نمایندوں کے طور پر اپنی کابینہ میں شریک کرے گا ریاستی اموال کی لوٹ مار سے یہ لوگ کیسے باز آسکتے ہیں۔ اگر خیبر پختون خوا کو ''مثالی صوبہ'' بنانا ہے تو عمران خان کو خود صوبے کا گورنر یا وزیر اعلا بننا چاہیے تھا۔ خیبر پختون خوا کی معاشی حالت ابتر ہے۔ اس کی آبادی ۲۰۱۲ء میں تقریباً انتیس ملین تھی جس میں سے تقریباً چوالیس فی صد افراد کی عمر پندرہ سال سے کم ہے، تقریباً چالیس فی صد افراد قومی غربت کی سطح سے نیچے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ شرح خواندگی بھی سینتالیس فی صد ہے۔ صوبائی بجٹ میں تقریباً پچاسی فی صد وصولیاں وفاق سے حاصل ہوتی ہے۔

ایم ایم اے حکومت کے آخری سال ۲۰۰۸ء کے بیرونی قرضے اور وفاق سے حاصل کی گئی رقوم صوبے کی اندرونی وصولیوں سے تقریباً تین گنا زیادہ تھے۔ اے این پی کے دور حکومت میں وفاق سے حاصل شدہ وسائل اور بیرونی امداد اور قرضوں پر انحصار تیزی سے بڑھا ہے۔ جماعت اسلامی اور تحریک انصاف نے صحت اور تعلیم کے فروغ کے لیے اپنے انتخابی منشور میں جو بڑے بڑے وعدے کیے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے صوبائی حکومت کے داخلی وسائل میں زبردست اضافے کی ضرورت ہے لیکن جماعت اسلامی اور تحریک انصاف کے منشوروں میں حکومتی بجٹ کے وسائل بڑھانے کی سرے سے کوئی تجویز موجود نہیں بل کہ پورا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زور ٹیکس کی شرح کو کم کرنے پر ہی دیا گیا ہے[1] اور ان منشوروں میں ٹیکس نیٹ بڑھانے کی واضح حکمت عملی موجود نہیں۔

لہٰذا ویل فیئر پروگرام کی توسیع کا پورا انحصار استعماری بھیک کے حصول اور وفاق سے اضافی ترسیلات پر ہوگا۔ اے این پی کی حکومت نے برطانیہ کی وزارت DFID کے حوالے سے جو سات سالہ منصوبہ بنوایا تھا (۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۰ء) اس میں منصوبے کے اخراجات کا چھیالیس فی صد کا حصہ استعماری بھیک کے حصول سے متوقع تھا۔ ہمارے وزیر خزانہ سے کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ Comprehensive Development Strategy کی ترجیحات سے انحراف کریں یا وہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی جرات کر سکیں جو ستمبر ۲۰۱۳ء میں حکومت آئی ایم ایف سے کر چکی ہے۔ ایم ایم اے کے دور حکومت میں بھی ہمارا وزیر خزانہ یورپی ممالک میں فنڈز جمع کرنے کے لیے پھرا اور اب بھی وہ یہی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ایم ایم اے کے دور حکومت میں ہمارا وزیر خزانہ سودی معاملات میں شریک رہا وہ اب بھی حکومت کے بجٹ کی تنفیذ ہی میں لگے رہیں گے۔ صوبائی حکومت بجٹ میں سود لے گی بھی اور دے گی بھی، زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ خیبر پختون خوا میں عمران خان کی جماعت سے جو ویل فیئر توقعات وابستہ کی گئی ہیں وہ پوری نہ ہوں، وفاق ترسیلات میں غیر معمولی اضافہ کیوں کرے۔ مسلم لیگ تو بلوچستان ہی کو ترجیح دے گی۔ پھر مسلم لیگ عمران خان کی کامیابی کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی ہے۔ افغانستان سے انخلا کے بعد اس کا امکان بھی موجود ہے کہ پختون خوا کی استعماری امداد میں نمایاں کمی آئے گی اگر استعماری امداد باقی رہتی ہے تو مجاہدین کے خلاف کارروائیاں تیز کرنی ہوں گی اور چوں کہ مجاہدین کو شکست دینا ناممکن ہے[2] لہٰذا اس مزاحمت کا نتیجہ امن عامہ کے فقدان کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اور اگر امن عامہ کی حالت ابتر ہوئی تو رفاہی کام کو جاری رکھنا مشکل سے مشکل ہوتا چلا جائے گا۔

اس کا خطرہ واضح ہے کہ عمران خان کی بی ٹیم بن کر ہم کو اس سے کہیں زیادہ نقصان ہو جو ضیاء الحق اور نواز شریف کی بی ٹیم کی حیثیت سے ہمیں برداشت کرنا پڑا تھا۔ تمام کام یابیوں کا سہرا عمران خان اور ان کے بدمعاش کارکنوں کے سر پر سجایا جائے گا۔ ہماری اسلامی ساکھ متاثر ہوگی چوں کہ ہمارا وزیر خزانہ سود لینے اور دینے اور استعمار کی تابع داری پر مجبور ہوگا

---

[1] ایک زمانے میں امریکا میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ ٹیکس کی شرح کم کر کے وصولیاں بڑھائی جا سکتی ہیں لیکن متعدد تجزیاتی مقالوں نے جو NBER نے شائع کیے ہیں، یہ بات غلط ثابت کر دی۔

[2] یہ بات ان تمام mezzanine تحریکوں کے لیے کہی جا سکتی ہے جو سرمایہ دارانہ نظریات اپنانے کو تیار نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہمارے پارلیمانی نمایندے عمران خان کے بدمعاش مشیروں اور وزیروں کی کرپشن نہ روک سکیں گے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم عمران خان سے اشتراک کو اپنی عوامی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے استعمال کریں اگر ہم عمران خان کو اس بات پر راضی کرنے میں کام یاب ہو گئے کہ وہ فوج کو مجاہدین کی mezzanine انتظامیہ سے نبرد آزمائی چھوڑنے پر آمادہ کرے اور امریکی استعماری اقدام سے معذرت کر لے تو صوبہ پختون خوا میں امن عامہ کی صورت یقیناً بہتر ہو گی۔ ہمیں مجاہدین اسلام کو بھی اس حکمت عملی کو قبول کرنے کے لیے راضی کرنا ہوگا اور یہ تبھی ہوسکتا ہے جب ہم ملک میں مجاہدین اسلام کی موثر سیاسی وکالت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اسلامی ادارتی صف بندی کی حکمت عملی

اس کے ساتھ ساتھ ہم حکومت میں اپنی شمولیت کو معاشرتی ادارتی صف بندی کے ایک ری سورس کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بہ حیثیت ایک انقلابی جماعت کے ہمارا مستقبل اس پیش رفت سے وابستہ ہے جو ہم ریاست کے اندر ریاست بنانے کے ضمن میں کریں اور جس کے ذریعے اقتدار سرمایہ دارانہ ادارتی صف بندیوں سے منتقل ہو کر اسلامی mass اداروں میں مرتکز ہو جائے۔ پختون خوا میں اگر ہم:

۱۔ بین المسالک مساجد کے وفاق کے قیام

۲۔ ایسے اسلامی کاروبار کے فروغ جس کا سود کے بازار اور سٹہ کے بازار سے تعلق نہ ہو، کے فروغ

۳۔ قبائلی نظام میں بزرگوں اور دین دار پیش واؤں کی قیادت کے استحکام اور فروغ

کی جدوجہد کریں تو اس سے ایک علاقائی اسلامی نظام اقتدار کی بنا قائم کی جاسکتی ہے۔ اس کام میں حکومتی مشینری استعمال کی جاسکتی ہے اور پارلیمنٹ میں تحریک انصاف کو جو اعانت دی گئی ہے اس کو اس بات سے مشروط کیا جاسکتا ہے کہ صوبائی حکومت ہمارے اس ادارتی صف بندی کے اقدام کو برداشت کرے گی اور اس کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے گی۔

اس نوعیت کی پیش رفت کے لیے حسب ذیل وزارتیں حاصل کرنا مفید ہوسکتا ہے:

۱۔ وزارت داخلی امور (Home Office Affair) اور قانون

۲۔ وزارت رابطہ مقامی حکومت (Ministry of Local Government)

اگر ان وزارتوں سے علاقائی سطح پر ادارتی صف بندی کے کام میں سہولت حاصل کرنا ہے تو لازم ہے کہ ان کے ذمہ دار افسران کی صفوں میں زیادہ سے زیادہ اپنے کارکنان کو جلد از جلد شامل کیا جائے اور ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ بنایا جائے جس کے ذریعے ہمارے جو کارکن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سرکاری عہدوں پر فائز کیے گئے ہیں ان کی نگرانی اور ہدایت جماعت اسلامی کا صوبائی نظم کرے۔ ہر سرکاری عہدے دار کو جماعتی نظم متعین ٹاسک دے اور اس سرکاری عہدے دار کی کارکردگی کا مسلسل جائزہ لیتا رہے تا کہ اس کی کارکردگی بہتر ہو۔[1]

چوں کہ ہم ریاستی اقتدار اسلامی اداروں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا علما سے تعاون کرنا نہایت ضروری ہے۔ پچھلے انتخابی عمل کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم نے وہ باہمی مشاورت اور تعاون کی فضا برباد کر دی جو قاضی حسین احمد صاحب نے ان تھک جدوجہد کے بعد ہمارے اور دیوبندی اور بریلوی علما کے حلقوں کے درمیان قائم کی۔ قاضی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ کی مساعی کے نتیجے میں علما کے طبقوں میں جماعت کی تکفیریت ختم ہوگئی اور دیوبندی اور بریلوی علما نے جماعت کے خلاف فتاوے دینا بند کر کے جماعت کو ایک راسخ العقیدہ اسلامی جماعت کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ جمعیت علمائے اسلام دیوبندی علما کی نمایندہ جماعت ہے اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن جس حکمت عملی کی تنفیذ کے ذریعے مساجد، مدارس اور دینی نظام تعلیم کو ریاستی اور استعماری دست برد سے محفوظ رکھ رہے ہیں اس کی تائید علمائے دیوبند کی عظیم اکثریت کرتی ہے۔ یہ وہی تحفظ دین کی حکمت عملی ہے جو جمعیت علمائے ہند ۱۹۲۰ء سے اپنائے ہوئے ہے۔ آج استعمار کی بھرپور کوشش ہے کہ علمائے دیوبند کو غلبہ دین کی جدوجہد کا مخالف بنا دیں اور مولانا زاہد الراشدی اور لشکر جھنگوی دونوں کو استعمار نے یہی ذمہ داری سونپی ہے۔ اب نواز شریف بھی اس جدوجہد میں شامل ہوگیا ہے۔ ہمارے امیر سید منور حسن صاحب نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن کی تنقید نہایت سخت انداز میں کی ہے اور ہماری پریس بالخصوص فرائیڈے اسپیشل مولانا فضل الرحمٰن پر مستقل ایسے الزامات لگاتا رہتا ہے جس کا وہ کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جماعت اور مولانا مودودی کے خلاف دوبارہ دیوبندی فتاوا آنا شروع ہو جائیں گے[2] اور قاضی صاحب کا تمام کام برباد ہو جائے گا۔ ہمیں اس مغالطے کو جلد از جلد ترک کر دینا چاہیے کہ ہم پختون خوا میں جمعیت علمائے اسلام کا

---

[1] ایم کیو ایم نے کراچی پر جو انتظامی گرفت قائم کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس میں کام یاب ہوئی ہے کہ صوبائی محکموں میں بڑی تعداد میں اپنے کارکن داخل کرے بل کہ اس نے اس بات کا موثر انتظام بھی کیا کہ اس کے داخل کردہ سرکاری کارکن پارٹی کے اعلا نظم کے تتبع رہیں اور ان کی مستقل نگرانی کی جاتی رہے۔

[2] ابھی تک مولانا فضل الرحمٰن اور جمعیت سے متعلق علما نے بردباری کا مظاہرہ کیا ہے اور فتاوا جاری ہونا شروع نہیں ہوئے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متبادل بن سکتے ہیں کیوں کہ ہماری صفوں میں جید دیوبندی علما موجود نہیں ہیں اور جمعیت علمائے اسلام سے مخاصمت بڑھی تو علما سے مخاصمت صرف پختون خوا میں نہیں پورے ملک میں بڑھے گی[1] یہ مخاصمت جمعیت اور جماعت دونوں کو سیکولرائز کر دے گی اور جماعت اسلامی میں ماڈرنائزیشن کا زہر برق رفتاری سے پھیلے گا۔

لہٰذا جمعیت کے خلاف مخاصمت کی فضا کو فی الفور ختم کرنا نہایت ضروری ہے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ جمعیت جلد از جلد پختون خواہ کی صوبائی حکومت میں شریک ہو۔ ہمیں پختون خوا میں جمعیت اسلام کے جونیئر شریک کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے، اس سے دینی اور سیاسی مستقل مشاورت کا انتظام کرنا چاہیے اور اپنے تمام سیاسی اور معاشرتی اقدامات اور پالیسیاں جمعیت کے ساتھ اشتراک عمل کی بنیاد پر وضع کرنی چاہییں۔ ماڈرنائزیشن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے۔

جماعت کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ ماڈرنائزیشن سے ہے اگر ہم نے صوبائی وزارت خزانہ کا قلم دان ترک کیا تو پختون خوا میں ماڈرنائزیشن کے اس عمل کو مہمیز ملے گی۔ پختون خوا کے ۲۰۱۴ء سے لے کر ۲۰۱۷ء تک صوبائی بجٹوں کے خدوخال حکومت برطانیہ کی وزارت DFID، ورلڈ بینک کے تعاون سے بنا چکی ہے[2] چوں کہ پختون خوا میں ترقیاتی کام کا دارومدار بیرونی بھیک اور وفاقی ترسیلات پر ہے اور وفاق آئی ایم ایف کے ساتھ ایک طویل المدت معاہدہ کر چکا ہے لہٰذا پختون خوا کے آیندہ چار سال کے بجٹ وہی ہوں گے جو DFID نے وضع کیے ہیں۔ ہمارا وزیر خزانہ سود لینے اور دینے پر مجبور ہوگا۔ وہ پوری دنیا میں استعمار سے مدد لینے پر مجبور ہوگا۔ وہ ریاستی خرد برد کو روکنے میں ایک بدمعاش وزیر اعلا کے سامنے بے بس ہوگا جیسا کہ ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۸ء کے دور میں تھا اور اس بے بسی کے نتیجے میں جماعت کی عوامی جگ ہنسائی ہوگی۔

اختتامیہ

جماعت کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ ماڈرنائزیشن سے ہے ماڈرنائزیشن کے عمل ہی نے ہماری نظریاتی شناخت کو تباہ کیا۔ ماڈرنائزیشن کے نتیجے میں ہم اپنی اسٹریٹ پاور کھو

---

[1] یادش بہ خیر قاضی صاحب ہمیشہ فرماتے تھے "ہم علما کے خادم ہیں جب وہ حکم دیں گے ہم حاضر ہو جائیں گے"۔

[2] ان بجٹوں کے تخمینہ خا کے حکومت بلوچستان کی دستاویز Khyber Pakhtunkhawa: A comprehensive Development Strategy Vo.II Background Estimates میں دیکھی جا سکتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیٹھے ہیں اور عمران خان کی بی ٹیم بن کر اپنی اکسٹھ سالہ انتخابی حزیمت پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ جماعت کی ماڈرنائزیشن کے نتیجے ہیں ہم نے عملاً مولانا مودودی کے دو کلیدی نظریات ''اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام حیات ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے'' کے معاشرتی اور ریاستی اظہار کے فریضہ کو ترک کر دیا ہے۔ ہم شہادت حق کا فریضہ انجام نہیں دے رہے بل کہ سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد کر رہے ہیں اور یہ جدوجہد بھی اس قدر بے اثر ہے کہ مقتدر سیاسی قوتیں ہم سے سیٹ ایڈجسٹمنٹ تک پر آمادہ نہیں۔ ۱۹۷۷ء میں کوئی ملکی سیاسی جدوجہد ہماری مرکزی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر موثر نہ ہو سکتی تھی ۲۰۱۳ء میں ہماری کسی کو بھی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

اور ہم سوائے شور کے کچھ بھی نہ کر سکیں
کیا خوب لڑ رہے ہیں کہ ماریں نہ مر سکیں

جماعت کا پریس مستقل اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ جماعت کی سیاسی اور معاشرتی پالیسیوں پر تنقید سے جماعت کے وجود کو خطرہ ہے۔ جماعت کے وجود کو خطرہ اس تنقید سے نہیں ماڈرنائزیشن کے تسلسل سے ہے اگر یہ روش جاری رہی تو ہم برادر تنظیموں کی بے ساکھیوں پر سوار ایک پریشر گروپ بن جائیں گے اور ہمارا انجام تحریک احرار سے مختلف نہ ہوگا۔

جاوید اکبر انصاری
مئی ۲۰۱۳ء

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

سوشل سائنسز جمہوریت اور اسلامی بینکاری

فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ

مولانا
زاہد صدیق مغل

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

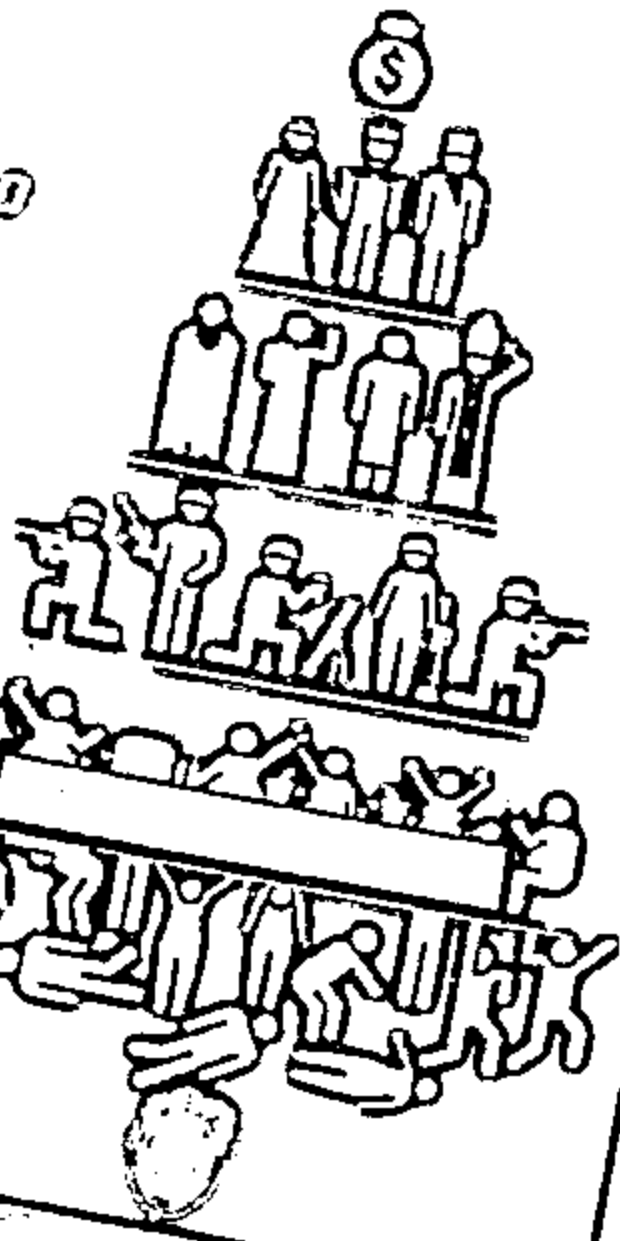

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

موجودہ بینکاری کا اسلامی متبادل

اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کی عملی تجویز

سید محمد یونس قادری

موجودہ بینکاری کا اسلامی متبادل

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹ - جے ماڈل ٹاؤن - لاہور
25469

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

کیپٹل ازم اور اس کے ذیلی نظریات باطلہ کے محاکے پر مشتمل

دیگر مطبوعات وراثت

سوشل سائنسز، جمہوریت اور اسلامی بینک کاری

فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ

زاہد صدیق مغل

ڈویلپمنٹ ڈکشنری (اردو ترجمہ)

مترجم: کامران سلیمی

سرمایہ دارانہ عقائد و نظریات

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سرمایہ داری کے نقیب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

انقلابی عمل ایک اسلامی تجزیہ

مرتبین: امین اشعر، خالد جامعی، محبوب الحسن بخاری

موجودہ بینک کاری کا اسلامی متبادل

سید محمد یونس قادری

Rs. 70/ Net

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور +92 322 4539 047, +92 321 2849 000